©All rights reserved

Teen Ilmi-o-Fikri interviews
By:Khushtar Noorani
First edition: 2009

Idara-e-Fikre Islami,Delhi
Distributed by:Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6
Phone:011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com

جہاد اور دہشت گردی | اجتہاد و تقلید | اور انقلاب ۱۸۵۷ء

پر مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے

تین علمی وفکری انٹرویوز

خوشتر نورانی

ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اکتوبر/۲۰۰۲ میں ماہنامہ جام نور دہلی، مذہبی صحافت میں ایک صحت مند انقلاب کی دعوت، مسلکی و مذہبی غیر ضروری رسوم وروایات کے خلاف ایک تحریک اور تعلیم، معیشت اور دعوت وتبلیغ کے حوالے سے نئی نسل کی ذہنی وفکری تشکیل کے اعلامیہ کے ساتھ منظر عام پر آیا- مذکورہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ مذہبی صحافت کا جو روایتی ڈھانچہ ہے اسے منہدم کر کے نئے انداز وروایت پر اس کی تعمیر وتشکیل کی جائے، تاکہ وہ کم وقتوں میں اثر انداز ہوکر اپنے ممکنہ ہدف کو پا سکے- جس کے لیے ہم نے طباعت اور پیش کش کے ساتھ مشمولات پر خصوصی توجہ دی اور انہیں نئے رنگ وآہنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی- جلدی ہی جام نور کے مشمولات میں بے لاگ تبصرے، بے باک تنقید وتجزیے، عصری مسائل پر کھلے مباحث اور مذہبی، ملی، سیاسی اور ادبی شخصیات کے ساتھ انٹرویوز اس کی پہچان بن گئے- قیافہ شناسوں نے اس کے تابناک مستقبل اور ہمہ گیر اثرات کا اشاریہ دیا تو رجعت پسندوں نے اسے ''مسلکی روایات'' سے نئی نسل کی بغاوت کا بنیادی سبب قرار دیا- ان کا یہ خیال غلط بھی نہیں ہے- ٹھہرے ہوئے پانی میں جب پتھر پھینکا جائے تو ارتعاش کا پیدا ہونا فطرت کا لازمہ ہے-

جام نور کے مشمولات اور اسلوب کی انہی خصوصیات کے حوالے سے برصغیر کے مذہبی اردو حلقے میں اسے شہرت اور منفرد پہچان ملی، کیونکہ ماضی میں نکلنے والے اردو کے مذہبی رسائل ایسے مشمولات سے یکسر خالی تھے- ان مشمولات میں خصوصی طور پر انٹرویوز کو کافی مقبولیت ملی جس کی باقاعدہ روایت جام نور نے ڈالی اور اب جبکہ اپنی اشاعت کے یہ سات برس پورے کر چکا ہے، انٹرویوز کا یہ کالم تسلسل کے ساتھ جاری ہے- اب تک جام نور نے مختلف حلقوں سے سو سے زائد ارباب علم وفکر سے براہ راست یا بالواسطہ انٹرویوز لیے ہیں

جنہیں دستاویزی حیثیت حاصل ہے-

جام نور کے زیادہ تر انٹرویوز ایسے ہیں جو شخصی اور ذاتی نوعیت کے ہیں یا پھر ایسے مسائل پر ہیں جن کا تعلق براہ راست انٹرویو دینے والی شخصیت سے ہو- لیکن ان میں تین ایسے بھی انٹرویوز ہیں جو امت مسلمہ کے مشترکہ مسائل ''جہاد اور دہشت گردی''، ''اجتہاد و تقلید'' اور ''انقلاب ۱۸۵۷ء'' کے حوالے سے ہیں- مذکورہ تینوں انٹرویوز کو جام نور کے تمام سو سے زائد انٹرویوز میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، جس کے دو اسباب ہیں:

ان انٹرویوز کی اہمیت کا پہلا سبب ان کے موضوعات ہیں، جو صدیوں سے امت مسلمہ کے درمیان زیر بحث رہے ہیں اور قرائن بتا رہے ہیں کہ رہتی دنیا تک یہ موضوعات امت کے درمیان تر وتازہ رہیں گے اور ان پر مختلف جہتوں سے مباحث ہوتے رہیں گے-

دوسرا سبب ان کی بین المسلکی حیثیت ہے- مذکورہ موضوعات پر انٹرویوز لینے میں اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ امت مسلمہ کے تمام بنیادی مسالک کے نمائندوں کو ان میں شامل کیا جائے، کیونکہ یہ امت کے مشترکہ مسائل ہیں اور جب تک تمام مسالک کے ارباب نظر کی آراء ان پر حاصل نہیں کی جاتی ان موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا- اس خیال کے پیش نظر اول الذکر دو موضوعات ''جہاد اور دہشت گردی'' اور ''اجتہاد وتقلید'' پر پندرہ مبسوط اور مفصل سوالات ترتیب دیے گئے اور انہیں جماعت اہل سنت، جماعت اسلامی، اہل حدیث، دیوبندی اور اہل تشیع کے نمائندوں کے پاس ارسال کیے گئے، تاکہ ان کے جوابات کی روشنی میں کوئی متفقہ نتیجہ برآمد ہو سکے اور متلاشیان حق کو ان مسائل میں اسلام کے صحیح موقف تک رسائی ہو- جب کہ مؤخر الذکر تیسرے موضوع ''انقلاب ۱۸۵۷ء'' پر دو ماہرین سے (جن میں ایک کا تعلق مذہبی اور دوسرے کا عصری دانش گاہ سے ہے) جوابات حاصل کیے گئے، اس یقین کے ساتھ کہ انقلاب ۱۸۷۵ء کے قائدین کے حوالے سے تاریخ کے متعصّبانہ رویے کی ضرور اصلاح ہوگی- اس سلسلے میں ہماری کوششیں کتنی بارآور ہوئی ہیں، یہ انٹرویوز کا مطالعہ بتائے گا-

خوشتر نورانی یکم نومبر ۲۰۰۹ء

جہاد اور دہشت گردی

11 / 9 کے حادثے کے بعد پوری دنیا میں اسلامی قوانین ونظریات اور مسلمانوں کے مذہبی، قومی اور سیاسی رجحانات عالمی بحث کا موضوع بن گئے- یہ بحثیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوطرح کی ہیں- پہلی نوعیت ایسی بحثوں کی ہے جس میں میڈیائی پروپیگنڈے سے قطع نظر خالص علمی اور تاریخی پیرائے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک ''جہاد'' اور ''دہشت گردی'' کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور کیا مذکورہ دونوں الفاظ فکری اور عملی طور پر اپنے اندر ایک ہی معنی رکھتے ہیں یا معنوی حیثیت سے دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں- اگر مختلف ہیں تو پھر وہ کیا اسباب رونما ہوئے کہ چند مسلم تنظیموں نے جہاد کے نام پر دہشت گردی کا لبادہ اوڑھ لیا- جبکہ دوسری نوعیت ایسی بحثوں کی ہے جو مذہبی مخاصمت، میڈیائی پروپیگنڈے اور عوامی رجحانات کے زیر اثر ہیں، جس میں اسلام اور مسلمانوں کو یک طرفہ مجرم قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے- افسوس ہے کہ ان مباحث کو ایک صدی گزر جانے کے باوجود آج تک اجتماعی طور پر کوئی متفقہ نتیجہ بر آمد نہ ہوسکا- اس کی بنیادی وجہ مذہبی تعصب بھی ہے، عوامی ناواقفیت بھی اور سیاسی مصالح بھی، جو جہاد اور دہشت گردی کے تعلق سے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ کو صاف نہیں ہونے دیتے- لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی صاف ستھری حیثیت کو مسخ کرنے میں جہاں مذہبی تعصب، عوامی ناواقفیت اور سیاسی مصالح کی کارفرمائی ہے وہیں بلکہ ان سے زیادہ اندرون خانہ خود مسلمانوں کی ان مذہبی وسیاسی تنظیموں اور تحریکوں کا ہاتھ ہے جن کے متشددانہ مسلکی نظریات نے ''جہاد'' اور ''دہشت گردی'' کے درمیان ایک بڑے فرق کو ختم کرڈالا ہے اور اپنے افراد کو یہ عرفان بخشا ہے کہ اس فرق کو مٹا کر ہی بہشت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے- چنانچہ انہوں نے افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور یورپ وامریکہ کے

مختلف خطوں میں بے قصور لوگوں کو اپنے نام نہاد جہاد کا نشانہ بنایا، جمہوریت کا بائیکاٹ کیا، جمہوری الیکشن میں شرکت پر حرمت کا فتویٰ جاری کیا اور مسلم عورتوں اور بچوں کی تعلیم پر پابندی عائد کر کے ان کو جہالت کی تاریکی میں رکھنے پر اصرار کیا-

مفروضہ شرک کے خاتمے اور بہشت کے حصول کے لیے مذکورہ احمقانہ عمل اب بھی دنیا کے مختلف علاقوں میں جاری ہے- اسلام اور جہاد کے نام پر ان غیر اسلامی اقدامات کے ردعمل میں عالمی سطح پر بے چینی، پروپیگنڈے، الزامات اور بحثوں نے اسلام اور مسلمانوں کو بری طرح داغدار کیا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ اقدامات اور ان پر اقوام عالم کے ردعمل نے دنیا کے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر خواب غفلت سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا اور ان کے ایک بڑے طبقے کے نام نہاد جہاد اور دہشت گردی کے خلاف علمی، فکری اور عوامی احتجاج اور واضح نقطۂ نظر نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو یہ باور کرا دیا کہ امت مسلمہ نظریاتی طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے- امت کا پہلا طبقہ صوفی اسلام سے تعلق رکھتا ہے جو داعیانہ اوصاف کا حامل ہے اور محبت، رواداری اور انسانیت کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے، در اصل یہی طبقہ اپنی عددی اکثریت کے ساتھ موروثی اور تاریخی طور پر حقیقی اسلام کا نمائندہ بھی ہے- جبکہ دوسرا طبقہ وہابی اسلام کی نمائندگی کرتا ہے، جو اپنے ہدف کے حصول کے لیے تشدد، سختی، انتشار، بے اعتدالی اور جنگ وجدال پر اصرار کرتا ہے- امت کا یہ طبقہ اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے جو عددی طور پر بہت کم ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کو مطعون اور متہم کرنے کا براہ راست یا بالواسطہ ذمہ دار ہے- یہ محض الزام نہیں، کیونکہ تلاش وجستجو کے بعد اس حقیقت کا سراغ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ ایسی تمام مسلم تنظیمیں اور تحریکیں جو جہاد کے نام پر دہشت گردانہ کارروائیوں میں مصروف ہیں ان کا تعلق امت کے اسی دوسری طبقے سے ہے- اس سچائی کو مزید واشگاف کرنے کی ضرورت ہے تاکہ داخلی سطح پر امت کے بھولے بھالے افراد ان کے اس مذہبی وسیاسی تشدد میں فکری وعملی طور پر معاون نہ بن سکیں

اور بیرونی سطح پر دنیا کو یہ پیغام دیا جا سکے کہ ''ہر مسلمان دہشت گرد نہیں''-

واضح رہے کہ امت کے اس طبقے کا کوئی وکیل صفائی اگر یہ کہتا ہے کہ عالمی امن اور جمہوریت کے تحفظ کے نام پر مسلم ممالک پر امریکی، برطانوی اور اسرائیلی فوج کشی اور ان کا غاصبانہ تسلط بھی تو کھلی دہشت گردی ہے؟ ایسا کہنے والا یقیناً حق بجانب ہوگا، مگر یہ ایک الزامی جواب تو ہوسکتا ہے، جہاد کے نام پر دہشت گردانہ کارروائیوں کو جواز نہیں فراہم کر سکتا- اسلام امن وسلامتی اور محبت و رواداری کا داعی ہے اور ضرورتاً استثنائی طور پر کچھ شرطوں کے ساتھ ''دفاعی جنگ'' کی اجازت دیتا ہے- جو جہاد کے وسیع تر مفہوم (نفسانیت، ظلم اور برائیوں کے خاتمے) کا ایک حصہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں- یہ دفاعی جنگ جابر حکمرانوں اور ان کی افواج سے لڑی جائے گی، مظلوم رعایا سے نہیں-

جہاد اور دہشت گردی کے مذکورہ مفہوم کو امت کے بڑے طبقے تک پہنچانے کے لیے مئی/۲۰۰۴ء میں اردو کے مذہبی رسائل وجرائد کی دنیا میں پہلی بار ماہنامہ ''جام نور'' نے ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ''جہاد نمبر'' نکالا تھا جس کی پوری برصغیر میں پزیرائی ہوئی- اس خصوصی شمارے میں برصغیر کے تمام مکاتب فکر کے نمائندوں سے ایک تفصیلی اور خصوصی انٹرویو کا بھی اہتمام کیا گیا تھا تاکہ ان کے جوابات کی روشنی میں امت مسلمہ پر یہ واضح ہو سکے کہ وہ امت کے دو طبقوں میں سے کس طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں- اُس طبقے کی جو امن اور محبت کے ذریعے اپنے مسائل کا تدارک اور اسلام کی توسیع چاہتا ہے یا اُس طبقے کی جو جنگ وجدال اور تشدد کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو پوری دنیا کے سامنے ذلیل ورسوا کر رہا ہے- کیونکہ عصر حاضر کے اس حساس اور نازک مسئلے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اگر داخلی طور پر باشعور اور بیدار ہو جائے تو پھر بیرونی سطح پر اس مسئلے کو ختم کرنا کوئی مشکل نہیں رہ جاتا- اس انٹرویو میں ۱۳/ وقیع سوالات پر جن علماء نے اپنے اپنے مسلک کی نمائندگی کی ہے وہ ذمہ دار بھی ہیں اور معروف بھی- ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا یٰسین اختر مصباحی، بانی وسربراہ دارالقلم دہلی

(۲) مولانا وحیدالدین خان، صدر اسلامی مرکز دہلی

(۳) مولانا شفیع مونس، نائب امیر جماعت اسلامی ہند دہلی

(۴) مولانا عبدالوہاب خلجی، سابق ناظم عمومی جمعیۃ اہل حدیث دہلی

(۵) مولانا انظر شاہ کشمیری، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

(۶) مولانا کلب جواد نقوی، رہنما جماعت اہل تشیع لکھنؤ

سوال:-(۱) قرآن واحادیث کی روشنی میں نظریۂ جہاد کی وضاحت فرمائیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-قرآن وحدیث میں صراحت وضاحت کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے- اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے، حق کا بول بالا کرنے، باطل کی سرکوبی کرنے، ظلم کے خلاف صف آرا ہونے اور انسانیت کے تحفظ کے لیے مسلمانوں پر جہاد کو فرض کیا گیا ہے اور اس میں کسی بھی طرح حصہ لینے والے مجاہدین کے لیے اجر وثواب کا اللہ رب العزت نے وعدہ فرمایا ہے- یہ جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب اس کی شرطیں پائی جائیں گی اور اس کے اصول وحدود اور آداب کا پاس ولحاظ اور ان کی پابندی ہر مجاہد کے لیے ضروری ہے- جس کا نمونہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام مختلف جہادوں کے دوران پیش کر چکے ہیں- ہر جہاد کے اندر اس عملی نمونہ کی پابندی لازمی ہے-

مولانا وحیدالدین خاں:-قرآن اور حدیث میں ''جہاد'' کا لفظ اصلاً پرامن جدوجہد کے لیے آیا ہے- جہاں تک مسلح جنگ کا تعلق ہے، اس کے لیے قرآن اور حدیث میں قتال کا لفظ استعمال ہوا ہے- جہاد کا لفظ اگر کہیں جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو وہ اس لفظ کا ایک توسیعی مفہوم ہے، نہ کہ اس کا اصل مفہوم-

مولانا شفیع مونس: - جہاد کے لغوی معنیٰ ہیں کسی کام یا مقصد کے حصول کے لیے انتہائی جدوجہد کرنا، جہد نیکی کی راہ میں بھی ہوسکتی ہے اور بدی کی راہ میں بھی - اس لیے قرآن مجید نے مزید حد بندی کے لیے فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کیے تاکہ نفس کی کسی خواہش اور کوئی ذاتی غرض یا قومی مفاد یا عداوت کا جذبہ اس میں داخل نہ ہوسکے اور وہی کوشش مراد لی جائے جو صرف اللہ کے لیے ہو اور انہیں مقاصد میں صرف کی جائے جنہیں اللہ نے پسند فرمایا- انسان کے تمدنی بنیادی حقوق میں سب سے پہلا حق اس کے زندہ رہنے کا حق ہے اور سب سے پہلا فرض دوسروں کو زندہ رہنے دینے کا فرض ہے، جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو اس کے تحت رہ کر پرامن زندگی بسر نہیں کی جاسکتی اور اسے

فروغ حاصل نہیں ہوسکتا- یہ تو ہے انسان کی ناگزیر ضرورت کی بات، رہا اس کا اخلاقی پہلو تو کسی انسان ''ابن آدم، اپنے بھائی'' کو ناحق قتل کر دینا انتہا درجہ کی سنگدلی اور انسانیت دشمنی ہے، چنانچہ ایک مذہب کے لیے لازم ہے کہ اپنے پیروؤں کے ذمہ اس کی صحیح قدر و اہمیت پیدا کرے- چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(ترجمہ) ''وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ کیے کی سزا پائے گا-'' (الفرقان:٦٨)

اور خود رسول ﷺ نے بھی انسان کی جان اور اس کے خون کی حرمت جگہ جگہ بیان فرمائی- مثلاً:

(ترجمہ) ''بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے اور قتل نفس اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹ بولنا-''

مولانا عبدالوہاب خلجی: - جہاد قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک واضح عمل اور اجتماعی فریضہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو اسلام کی سب سے اونچی چوٹی قرار دیا ہے- جہاد ایک مشروع عمل ہے- شریعت اسلامی میں جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے جب کہ دہشت گردی اور فتنہ وفساد کو اسلام نے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہدایت دی ہے- ارشاد باری ہے'' **ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا** ''اسلام نے جہاد کو حق کی نصرت، ظلم و زیادتی سے دفاع، امن وسلامتی کی پائیداری اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے مشروع قرار دیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس رحمت وشفقت سے اہل جہاں بہرہ ور ہوسکیں، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، تاکہ وہ لوگوں کو جہالت کے تنگ و تاریک راستے سے نکال کر اسلام کی روشن شاہراہ پر گامزن کرسکیں اور اس کے ذریعہ دہشت گردی اپنی تمام شکلوں میں ختم ہوسکے-

جہاد کی مشروعیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کو ان لوگوں سے بھی تحفظ مل سکے جو اپنے توسیع پسند عزائم کے ذریعہ دوسروں کی زمین اور وطن پر ناجائز قابض ہونا چاہتے ہیں- ان کے مقاصد لوگوں کے مال ومتاع اور قومی املاک کو غصب کرنا اور

دوسروں کی زمین زور زبردستی سے ہتھیا کر خود کو اس جگہ آباد کرنا اور اس کے اصلی باشندوں یا مالکان کو نکال باہر کرنا بھی شامل ہے-

جہاد ان لوگوں کے خلاف بھی کیا جانا مشروع ہے جو دوسروں کی آبادیوں اور شہروں پر مظاہرے کرکے یا زبردستی قبضے کی کوشش کرتے ہیں- ان لوگوں کے خلاف بھی جہاد مشروع ہے جو افراد و اقوام کے درمیان عہد شکنی اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں- اسی طرح مسلمانوں کو فتنہ وفساد اور ضرر رساں اعمال سے چھٹکارا دلانے کی جدوجہد بھی جہاد میں شامل ہے- ان لوگوں کے خلاف بھی جہاد مشروع ہے جو لوگوں کے مال و جائیداد کو سلب کرلیں یا جہاں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی اشاعت و بیداری پیدا کرنے کی آزادی نہ ہو- ارشاد الٰہی ہے'' **لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم وتقسطو االیھم ان اللہ یحب المقسطین** (الممتحنہ:٨) ترجمہ: جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک واحسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے-

سوال: -(٢) مختلف ملکوں میں جو تنظیمیں جہاد کے نام پر جدوجہد کررہی ہیں ان سے جزوی یا کلی طور پر آپ کہاں تک متفق ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی: - دنیا کے اندر سرگرم مسلم تنظیموں کے ہر اقدام کو نہ جائز ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی حمایت کی جاسکتی ہے- اسی طرح مسلم تنظیموں کے ہر اقدام کو ناجائز ٹھہرانا اور اس کی مخالفت کرتے رہنا بھی صحیح نہیں ہے- اگر اسلام کے نام پر کوئی کام کیا جارہا ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے- اسلامی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے مسلم تنظیموں کی جو بھی سرگرمیاں ہیں وہ جہاد کے وسیع معنی ومفہوم کے دائرہ میں شامل ہیں - البتہ حرب وضرب اور قتل وخوں ریزی کے واقعات و حادثات کو آنکھ بند کرکے اصطلاحی جہاد بمعنیٰ قتال نہیں کہا جاسکتا- مسلم ممالک یا مغربی ممالک کے اندر سرگرم مسلم

تنظیمیں اس وقت اگر دنیا کے کسی حصہ میں اپنی مخالف طاقت کے سامنے سینہ سپر ہیں یا اس کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی حملہ کریں تو اسے اپنے تحفظ و دفاع یا انتقام کی پر جوش و استقلال انگیز کارروائی کہا جاسکتا ہے، مگر اسلامی جہاد کا نام اسے نہیں دیا جاسکتا-

مولانا وحیدالدین خاں: - غیر حکومتی تنظیموں کی طرف سے جہاد (بمعنیٰ قتال) کا عمل جو آج کل مختلف مسلم گروہوں کی طرف سے جاری ہے وہ بلا شبہ غیر اسلامی ہے- یہ سب جہاد کے نام پر فساد کا عمل ہے- کیوں کہ جہاد (بمعنیٰ قتال) سرتاسر حکومت کی ذمہ داری ہے - غیر حکومتی تنظیموں کے لیے پر امن دعوت ہے نہ کہ مسلح جہاد-

مولانا شفیع مونس: -مختلف ملکوں میں جو تنظیمیں دعوت حق اور فتنہ وفساد کے خلاف تعلیم وتلقین سے کام لے رہی ہوں ان کی جدوجہد سے یقیناً اتفاق کیا جائے گا- رہیں وہ تنظیمیں جنہوں نے مسلح جدوجد کی راہ اختیار کی ہو تو ان کے سلسلہ میں الگ الگ صحیح واقفیت نہایت ضروری ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اسلامی تعلیمات نے جو شرائط و آداب لازم قرار دیے ہیں ان کا کہاں تک پاس ولحاظ کیا جارہا ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی: - پوری دنیا میں ظلم وجبر کے خلاف اٹھائی جانے والی آواز ہر کلمہ گو کے دل کی آواز ہے- اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت اسلامی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی تمام مساعی جمیلہ سے ہر انصاف پسند کو متفق ہونا چاہیے-

سوال: - (۳) جہادی جدوجہد کے تحت عام شہریوں کو جو نشانہ بنایا جارہا ہے، کیا یہ عمل اسلامی نظریۂ جہاد سے ہم آہنگ ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی: - غیر متعلق شہری، عام آدمی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، عبادت گاہوں اور عوامی اداروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت اسلامی جہاد کے اندر بھی نہیں ہے تو عام جنگوں وحملوں میں ایسی حرکتیں کس طرح گوارہ کی جاسکتی ہیں؟

مولانا وحیدالدین خاں: - عام شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنانا کسی حال میں جائز نہیں، حتیٰ کہ کسی مسلم حکومت کے تحت ہونے والے جائز جہاد میں بھی نہیں- جائز جہاد میں بھی صرف مقاتل پر وار کیا جاسکتا ہے، غیر مقاتل پر وار کرنے کی گنجائش اسلام کے اصول

جنگ میں نہیں ہے-

مولانا شفیع مونس: - جہادی جدوجہد کے تحت صرف انہیں شہریوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہوں یا عقلاً وعرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں، یعنی جوان مرد، جن پر اہل قتال کی اصطلاح صادق آتی ہے اور ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی جاسکتی جو اہل قتال نہ ہو، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، مجنون، سیاح، خانقاہ نشیں زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ-

مولانا عبدالوہاب خلجی: - جہاد کے نام پر بے قصور، بے گناہ اور معصوم جانوں کا زیاں غیر اسلامی عمل ہے- اسلام میدان جنگ میں بھی اس امر کی شدت کے ساتھ رعایت رکھتا ہے، چہ جائیکہ عام شہریوں کو نشانہ بنایا جائے-

سوال: - (۴) کیا جہاد کے نام پر اسلام خودکش حملے کی اجازت دیتا ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی: - اسلام نے خودکشی کو ہر حال میں ناجائز قرار دیا ہے- یہ بزدلی بھی ہے اور جہنم میں لے جانے کا سبب بھی ہے- اسلام یا جہاد یا کسی بھی نام یا کسی بھی طریقہ سے خودکشی کرنا جائز نہیں ہے- اگر حقیقی جہاد ہو رہا ہو اور دشمن فوج پر کوئی مسلمان خودکش حملہ کرے جو اس وقت کہیں کہیں رائج ہے تو اس میں صرف خودکشی کا وبال ہے اور اگر عام حالات میں ایسا خودکش حملہ ہے تو یہ دوہرا جرم ہے کہ اس کے اندر خودکشی بھی ہے اور دوسروں کا خون ناحق بھی ہے-

مولانا وحیدالدین خاں: -خودکشی یا خودکش حملہ کرنا یقینی طور پر حرام ہے- جہاد کا نام دینے سے کوئی حرام کبھی حلال نہیں ہوسکتا- موجودہ زمانہ کے نام نہاد مجاہدین مختلف مقامات پر جو خودکش بمباری (Suicide bombing) کر رہے ہیں وہ بلا شبہ حرام ہے- خودکشی کسی بھی عذر کی بنا پر اسلام میں جائز نہیں- مزید یہ کہ یہ خودکش بمباری عام طور پر غیر مقاتلین (non-combatants) کے اوپر کی جاتی ہے، کیونکہ وہ سافٹ ٹارگٹ (Soft target) سمجھے جاتے ہیں- یہ دوسرا پہلو اس حرمت کو اور بھی زیادہ سنگین بنا دیتا ہے- اس کے نتیجہ میں اسلام کی جو بدنامی ہو رہی ہے وہ تمام نقصانات میں سب سے زیادہ

بڑا نقصان ہے-

مولانا شفیع مونس:- جہاد فی سبیل اللہ کے تقاضوں کی ادائیگی، شرائط وآداب کوملحوظ رکھتے ہوئے تو یقیناً نہایت اعلیٰ درجہ کا نیک کام ہے اوراس میں جان کی قربانی مجاہد کواللہ کی راہ میں شہادت کا اورآخرت میں جنت کے بلند مقام کا مستحق قرار دیتی ہے- جو حملے خودکشی کے ارادے اوراہتمام سے کیے جائیں اسلام ان کی اجازت نہیں دیتا-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- اسلام نے خودکشی کے عمل کوحرام قرار دیا ہے-اجتماعی مصالح اورامت کے تحفظ کے پیش نظراس کی گنجائش موجود ہے-ظلم وستم کی شدت وتشدد کو دیکھتے ہوئے اس کی رعایت کی جائے گی- علامہ یوسف القرضاوی نے اسے جائز قرار دیا ہے-ویسے یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس میں فقہائے امت کوغور کرنے کی ضرورت ہے-

سوال: -(۵)استعماری قوت سے اپنی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت کے تحفظ یا مسلم ممالک کے قدرتی وسائل کواستحصال سے بچانے کے لیے یا باطل قوتوں کی ناانصافیوں اورظلم وتغلب کے خلاف جو تنظیمیں جہاد کے نام پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں ان کے نتائج اب تک کتنے مثبت اور کتنے منفی ہوئے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- اسلام ومسلمین اور عالم اسلام کے مفاد کے خلاف استعماری قوتیں جو کچھ کررہی ہیں جس طرح مسلم ممالک پر غلبہ وتسلط اوران کے معدنی ذخائر وقدرتی وسائل کا استحصال کررہی ہیں ان سب کے سازشی وسامراجی عزائم کو ناکام بنانے کی ہر جائز ومفید کوشش ومزاحمت ضرور ہونی چاہیے-البتہ حکمت عملی اورمصلحت وقت کے پیش نظر جہاد، جہادی اورمجاہد جیسی اصطلاحات کے غیر ضروری استعمال سے اجتناب و احتراز کرنا ہی دانش مندی ودوراندیشی ہے-

مسلم تنظیموں کواپنی سرگرمیاں دفاع ومزاحمت کے نام سے اسلامی اصول کی پابندی اور بین الاقوامی ضابطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جاری رکھنا چاہیے- اپنی مسلم حکومتوں کے داخلی تصادم اور دیگر ممالک کے امور و معاملات میں مداخلت سے انہیں پرہیز کرنا چاہیے-ہراقدام وحملہ کو جہاد کا نام دینے سے اسلام دشمن عناصر جہاد کا نام بدنام کرتے ہیں

اورمسلمانوں کو دہشت گرد وجنگجو قوم کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں-اس کے علاوہ بعض مسلم ممالک کوطرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں اس کی وجہ سے جھیلنی پڑتی ہیں-قرآن اوراسلام پر بیجا حملوں کا ایک سلسلہ مخالفین کی طرف سے شروع ہوجاتا ہے، یہ اس کا منفی پہلو ہے اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اس طرح کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بہت سارے استعماریت پسند ممالک اپنے ملکوں کی سرحدوں کے اندر سمٹ کر رہ گئے ہیں، ان کے لیے اب آسان نہیں رہ گیا ہے کہ پہلے کی طرح جہاں چاہیں دندناتے پھرتے رہیں- ہاں! صرف امریکہ ایک ایسی سپر طاقت باقی رہ گئی ہے جس کے توسیع پسند عزائم کولگام نہیں دی جاسکی ہے، لیکن یہ بھی ہرجگہ کشمکش اور ذہنی اذیت میں مبتلا ہے اور امریکی جہاں بھی قابض ومتصرف ہیں ان کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہوتی جارہی ہے-

مولانا وحیدالدین خاں:- پانچویں سوال میں جن مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی بھی مقصد کے لیے غیر حکومت تنظیموں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مفروضہ دشمن کے خلاف مسلح جہاد چھیڑ دیں-ان مقاصد کے نام پر موجودہ زمانہ میں جو مسلح جہاد کیا گیا ہے وہ ایک غیر اسلامی فعل تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت حاصل نہ کرسکا اوراس بنا پر اپنے مقصد کے حصول میں مکمل طور پر ناکام رہا-

مولانا شفیع مونس:- استعماری قوت سے آزادی کا تو عوام کوازروئے اسلام بھی حق حاصل ہے اورموجودہ بین الاقوامی قوانین کی رو سے بھی، اس لیے جو جماعتیں اورقومیں اس کے لیے پرامن جدوجہد کررہی ہوں ان کواس کا حق بھی حاصل ہے اورکسی نہ کسی درجے میں پیش رفت بھی ہورہی ہے- البتہ جہاں کہیں مسلح جدوجہد ہوتی ہواس کے سلسلے میں جواز کا بھی سوال اٹھتا ہے اور یہ بھی مشکل ہے کہ صحیح اورمکمل معلومات کے بغیر اثرات ونتائج کے متعلق کچھ متعین طور پر کہا جاسکے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- استقلال وآزادی کے نام پر جاری سرگرمیاں بعض مقامات پر مثبت نتائج کی حامل رہیں، بعض مقامات پر امت کے خسارہ کا سبب بنیں، جس کی تفصیلات سے سبھی آگاہ ہیں- جن مقامات پر خلوص وللّٰہیت اور جذبہ صادق کے ساتھ

اسلامی شریعت کی روشنی میں جدوجہد کی گئیں وہاں کامیابی ان کے ہم قدم ہوئی اور جہاں مفادات، ذاتی مصالح اور کشورکشائی کے پیش نظر اقدامات کئے گئے وہ امت کے لیے مضر ثابت ہوئے-

سوال:-(٦) جن مقاصد کے حصول وتحفظ کے لیے جہادی تنظیموں نے جو طریقے اپنائے، کیا ان مقاصد کے حصول کے لیے یہی ایک راہ ہے؟ یا دوسرے طریقے بھی اپنائے جاسکتے ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- براہ راست ٹکراؤ سے بچتے ہوئے دوسرے طریقے اپنا کر اپنے مقاصد واہداف تک پہنچنا چاہیے- مذاکرہ وملاقات، صحافت وسفارت وسیاست وغیرہ کے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہیں انہیں اپنانے کی ضرورت ہے، لیکن یہ تنظیمیں شاید کہیں کہیں اور کبھی کبھی ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے صدیوں پرانے نسخہ پر عمل پیرا ہوجاتی ہیں جس سے وہ خود مبتلائے مصیبت ہوتی ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے-

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دنیا کی بہت ساری غیر مسلم تنظیمیں سازش اور تشدد کے بہت سارے طریقے اپناتی ہیں، لیکن یہ اس دور کی بدنصیبی ہے کہ نشانہ پر صرف مسلم تنظیمیں رہتی ہیں- ان کے ہر عمل کو دہشت گردی بلکہ اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے اور جب ایسا ہی کوئی کام فلسطین یا بوسنیا یا آئرلینڈ یا سری لنکا یا گجرات وآسام وغیرہ میں ہوتا ہے تو ان کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر انہیں یہودی یا مسیحی یا ہندو دہشت گردی کا نام نہیں دیا جاتا ہے- اس طرز فکر وعمل کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

مولانا وحیدالدین خاں:- چھٹے سوال میں جن مقاصد کا ذکر ہے ان کے حصول کی تدبیر صرف ایک ہے اور وہ پرامن جدوجہد ہے- تشدد پر مبنی جدوجہد کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں، جیسا کہ عملاً پیش آیا-

ان مقاصد کے لیے موجودہ زمانہ میں جو کوشش کی گئی ہیں وہ زیادہ تر جہاد یا ٹکراؤ کے

اصول پر مبنی ہیں، مگر موجودہ دنیا میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے- اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جذبات کے ساتھ خارجی حالات کا بے لاگ جائزہ لیں- خارجی حالات کی رعایت کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہماری کوشش کامیاب ہوسکے- موجودہ قسم کی جہادی سرگرمیوں میں یہ خارجی رعایت مفقود ہے- جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی، ہماری کوششیں ناکامی کے سوا اور انجام تک نہیں پہنچ سکتیں-

جہاد دراصل ایک پرامن جدوجہد ہے جو گہری منصوبہ بندی کی بنیاد پر کی جاتی ہے- جہاد کی عملی طور پر دو قسمیں ہوسکتی ہیں- ایک ہے کھوئے ہوئے پر جہاد اور دوسرا ہے ملے ہوئے پر جہاد- میرے مطالعہ کے مطابق موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے درمیان جہاد کے نام پر بے شمار ہنگامے جاری رہے، مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاد کے نام پر کی جانے والی یہ تمام سرگرمیاں کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنیٰ تھیں نہ کہ ملے ہوئے پر جہاد کے ہم معنیٰ-

امیر کابل کے تعاون سے شاہ ولی اللہ کا جہاد، سلطان ٹیپو کا جہاد، شہیدین کا جہاد، علمائے دیوبند کا جہاد، علی برادران کا احیاء خلافت کے نام پر جہاد، قیام پاکستان کے لیے جہاد، آر ایس ایس کے خلاف جہاد، بابری مسجد کے لیے جہاد، وغیرہ وغیرہ سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کی صورتیں ہیں- اس لیے یہ تمام جہادی قربانیاں حبط اعمال کا شکار ہوگئیں-

یہی معاملہ دیگر مقامات پر کیے جانے والے جہاد کا ہے- مثلاً فلسطین کا جہاد، بوسنیا کا جہاد، چیچنیا کا جہاد، فلپائن کا جہاد، اراکان کا جہاد، کشمیر کا جہاد وغیرہ، سب کے سب کھوئے ہوئے پر جہاد کے ہم معنیٰ تھا- اس لیے امت کو ان کے ذریعہ تباہی کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوا- میرے علم کے مطابق اس پوری مدت میں پوری مسلم دنیا میں جہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل ایسا نہیں جس کو ملے ہوئے پر جہاد کا نام دیا جاسکے-

اس معاملہ میں اب اصل ضرورت پورے معاملہ پر نظر ثانی (Reassesment) کی ہے نہ یہ کہ اپنی ناکامی کو دوسروں کے خانہ میں ڈال کر مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے- زندگی کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنی غلطی کی قیمت خود بھگتنی پڑتی ہے، ایک غلطی کی قیمت کوئی دوسرا شخص کبھی بھگتنے والا نہیں-

یہ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی الف ب ہے اور عجیب بات ہے کہ ساری مسلم دنیا کے مسلم رہنماؤں میں غالباً کوئی ایک شخص نہیں جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا ہو، خواہ وہ عربی داں مسلمان ہو یا انگریزی داں مسلمان۔

مولانا شفیع مونس:۔ جہاد حق کے لیے اولین کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ مخاطب افراد، جماعتوں اور قوموں کو دعوت حق سے روشناس کیا جائے اور فتنہ وفساد سے باز نہ آئیں تو طاقت کے استعمال پر غور کیا جائے۔ اگر کامیابی کی توقع ہو تو طاقت کا استعمال کیا جائے ورنہ اصلاح حال کی کوششوں کے لیے حتی المقدور پر امن ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اب یہ ہر اس قوم کے بارے میں دیکھنا ہوگا کہ کس قوم کو شر وفساد سے باز رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہو گیا ہے یا نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ فی الواقع اس درجہ کی طاقت ہو چکی ہے جس کی بنا پر بہ اطمینان اس کا استعمال کیا جا سکے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:۔ جہادی تنظیموں نے جو طریقے اپنائے ان کے علاوہ باہمی گفت وشنید، ڈائیلاگ اور بحث ومناقشہ کی راہ کھلی رہنی چاہیے، موجودہ حالات میں یہ ایک حل وسط اور مشکلات ومصائب سے نجات کی بہترین شکل ہے۔ جہادی تنظیموں نے اپنے مقاصد کے حصول وتحفظ کے لیے جو طریقے اپنائے ہیں اس سے قطع نظر کہ وہ کیا ہیں؟ اور کس تنظیم نے کون سے طریقے اپنائے ہیں؟ میرے نزدیک موجودہ حالات میں باہمی گفت وشنید، بحث ومناقشہ اور دلائل کے ذریعہ ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی راہ، ایک مؤثر ترین طریقہ ہے اور گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو کے شرعی نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور فریق مخالف کی چالبازیوں اور ذہنی وسعت کو بھی سمجھتے ہوں۔ اس سے بہتر نتائج برآمد ہونے کی امید کی جا سکتی ہے اور یہ ایک حل وسط بھی ہے نیز امت کو مشکلات ومصائب سے نجات دلانے کی بہترین شکل بھی ہے۔

سوال:۔ (۷) حکم جہاد کے نفاذ اور اس کو عملی طور پر شروع کرنے کے لیے کسی امام، خلیفہ یا قائد کے تعین کا اسلامی طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:۔ خلیفۃ المسلمین یا سلطان اسلام اپنے علمائے کرام اور

امراء وحکام کے مشورہ سے جب اعلان جہاد کرے تو وہ نافذ العمل ہوگا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وجود اور عزت وقار پر جب کسی غیر مسلم طاقت کی طرف سے حملہ ہو، کسی مسلم ملک کے اندر کوئی بیرونی طاقت گھس آئے تو ایسے ناگزیر حالات میں بشرط قوت وتیاری جہاد کیا جائے گا اور یہ اس دور اور اس ملک کے ارباب حل وعقد کی صواب دید اور ان کے فیصلے پر منحصر ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:۔ اسلام میں جہاد (بمعنیٰ قتال) کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ برائے دفاع ہے۔ دفاع کے سوا کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے جنگ چھیڑنا اسلام میں جائز نہیں، اور دفاع کی یہ جنگ اعلان کی لازمی شرط کے ساتھ صرف ایک قائم شدہ مسلم حکومت ہی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں گوریلا جنگ، پراکسی جنگ، جارحانہ جنگ، بلا اعلان جنگ سب ناجائز ہیں۔

مولانا شفیع مونس:۔ حکم جہاد کا نفاذ کسی امام یا سربراہ حکومت کو کرنا چاہیے، رہے افراد تو وہ خود اس کے مجاز نہیں ہیں کہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر کے قدم بڑھا سکیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے پیش نظر مقصد کے حصول کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ اس طرح کے اقدامات الٹے مزید فتنہ وفساد اور کشت وخوں ریزی کے باعث ہوں گے۔ رہا امام یا قائد وغیرہ کے انتخاب کا سوال تو اس کے لیے شورائی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے یعنی ان کا نصب ہو یا عزل، جمہور کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:۔ جہاد کے نفاذ اور شرعی حدود، قصاص، حد سرقہ، زنا وغیرہ کے لیے شرعی امام کا ہونا ضروری ہے، کسی فرد یا جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں، جہاں پر مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں بھی وہ ایک معاہدہ اور نظام کے پابند ہیں، اپنے امن وتحفظ، اسلامی شعار کی بجا آوری اور شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ اجتماعی نظام قائم کرنے کے لیے جو مناسب طریقے ہوں اسے اختیار کیا جانا چاہیے۔

سوال:۔ (۸) جہاد کو غلط طور پر پیش کر کے مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر جو سازشیں رچی جا رہی ہیں اور ان پر ہر طرح کے ظلم اور ناانصافی کو روا رکھا جا رہا ہے، اس کا

دفاع کس طرح ممکن ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- اسلام دشمن طاقتوں کی قدیم عادت وروایت ہے کہ وہ صرف جہاد نہیں بلکہ اسلام اور عالم اسلام کو نہایت بے شرمی وڈھٹائی کے ساتھ طعن وتشنیع کا نشانہ بناتی رہتی ہیں، جہاد کی غلط تعبیر وتشریح بھی اس کی ایک کڑی ہے- مگر اس کے ساتھ حالیہ دور میں ایک اضافہ یہ ہوا ہے کہ جب جس مسلم تنظیم کو یہ شر پسند طاقتیں چاہتی ہیں اسے جہادی کہہ کر اس کے ارکان وافراد کو مشق ستم بنانے لگتی ہیں- ایسی صورت میں دفاع کا کوئی نیا طریقہ نہیں بلکہ وہی پرانا طریقہ اپنانا ہوگا کہ اپنے آپ کو مذہبی، علمی، فکری، تجارتی، صحافتی، سیاسی، اخلاقی، عسکری ہر لحاظ سے اتنا مضبوط کرلیا جائے کہ کوئی آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کرسکے- اس کے علاوہ دیگر رائج الوقت جو بھی جائز ومناسب ومفید تدبیریں ہوں ان پر عمل کیا جانا چاہیے-

مولانا وحید الدین خاں:- آٹھویں سوال کے بارے میں میں کہوں گا کہ اس کے دفاع کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسلمان خود اپنی طرف سے ان تمام پر تشدد سرگرمیوں کو یکسر بند کردیں جو موجودہ زمانے میں جہاد کے نام پر چل رہی ہیں- مذکورہ مسئلہ صرف مسلمانوں کے خود ساختہ جہاد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے- اس خود ساختہ جہاد کے ختم ہوتے ہی مذکورہ مسئلہ بھی اپنے آپ ختم ہوجائے گا-

مولانا شفیع مونس:- مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر جو سازشیں ہیں ان کے دفاع کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ ایک طرف تو خود مسلمانوں کی طرف سے کہیں کوئی غلطی اور ناروا حرکت نہ ہونے پائے، ہر طرح کے حالات میں ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کی روشنی ہو، خود ان کے درمیان صحیح بنیادوں پر اتحاد اور لوگوں اور قوموں کو حق وصداقت کی راہ دکھائی جائے-

مولانا عبد الوہاب خلجی:- جہاد کے خلاف بین الاقوامی طور پر جو سازشیں رچی جارہی ہیں وہ ان غلط فہمیوں اور اسلام دشمن افراد، جماعتوں اور حکومت کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے- اس کے دفاع کے لیے اسلام کے نظریہ جہاد، امن وسلامتی اور باہمی ربط وتعلقات کو عام کرنا چاہیے- اسلام کے نظام عدل ومساوات اور حقوق انسانی کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانا

چاہیے، کتابی نظریات سے باہر نکل کر عملی شکل دینی چاہیے، نیز اسلامی معاشرہ میں عدل وقسط اور انسانی وقار کی عملی جھلک نظر آنی چاہیے-

سوال: -(۹) مستشرقین اور یورپ کے منصوبہ سازوں نے اسلام کے پاکیزہ نظریۂ جہاد کے خلاف امت مسلمہ کے دانشوروں اور نئی نسلوں کو ذہنی طور پر جو متأثر کیا ہے اس کی صفائی کس طرح ہوسکتی ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- مستشرقین ومحققین ومفکرین ومؤرخین یورپ وامریکہ جس طرح نظریۂ جہاد کا تعاقب اور اس کے بارے میں شوشے گوشے پیدا کرکے دنیا کو اور بعض مسلم روشن خیالوں یا جدید تعلیم یافتہ مسلم نسل کو جہاد سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں، البتہ اس کے اندر تیزی ضرور پیدا ہوگئی ہے- اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ جہاد کی اصل حقیقت سے انہیں آگاہ کیا جائے- اس کے لیے کتب ورسائل اور میڈیا کا استعمال کیا جائے اور افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کیا جائے-

اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مغربی میڈیا اور مغربی طاقتوں کی ایک مخصوص ذہنیت ہے اور بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والی خبروں میں ان کا ہی کنٹرول ہوتا ہے- جب جس مسلم ملک، مسلم حکمراں اور مسلم تنظیم کو چاہیں اسے نشانے بنا کر دنیا بھر میں بدنام کردیں، ایسا روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے- جہاد، جہادی اور مسلمان کے بارے میں اپنے مطلب ومفاد کے مطابق ان کی پالیسی بنتی بگڑتی رہتی ہے- بیس بائیس سال سے افغانستان وعراق میں جو کچھ ہورہا ہے اور کون کس وقت ان کا محبوب اور کس وقت ان کی بارگاہ کا مردود بن جاتا ہے اس کا حال کسے نہیں معلوم ہے؟

اسرائیل کی دہشت گردی سے سب نے آنکھیں بند کررکھی ہیں- مقبوضہ عرب علاقے خالی کرنے کرانے کا کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے- صبرا وشتیلا کیمپوں میں ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کوئی دہشت گردی نہیں؟ فلسطینیوں کے منتخب لیڈر یاسر عرفات کی تبدیلی کا اسرائیلی وامریکی مطالبہ اور ان کے ہیڈکوارٹر کا محاصرہ کوئی دہشت گردی نہیں ہے؟ مارچ ۲۰۰۴ء میں شیخ احمد یٰسین کو اسرائیلی حکومت نے خاک وخون میں تڑپایا ہے یہ بھی کوئی دہشت گردی

نہیں، جس کے خلاف اقوام متحدہ میں مذمتی قرارداد ویٹو کرنے کی امریکہ مسلسل دھمکی دے رہا ہے؟ اور خود اقوام متحدہ کے اصول اور اس کی قراردادوں کو روندتے ہوئے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے لیے اس پر بلا جواز جملہ و بمباری کی امریکی حرکت بھی کوئی دہشت گردی نہیں ہے؟ ان سب کی نظر میں دہشت گردی بس وہی کام ہے جس کے ساتھ کوئی مسلم نام وابستہ ہو- کیا یہ اس دور کی ایک نہایت تلخ حقیقت نہیں ہے؟

مولانا وحیدالدین خاں:- اسلام کے پاکیزہ نظریہ جہاد کو داغ دار کرنے والے خود مسلمان ہیں- یہ دراصل مسلمان ہیں جنہوں نے اسلامی جہاد کی تصویر کو اپنی غلط روش سے بگاڑا ہے- اس مسئلہ کا حل بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی غلط روش کو بند کردیں- اس کے بعد دوسروں کو کسی سازش کا موقع نہیں ملے گا-

مولانا شفیع مونس:- مستشرقین اور یورپ کے منصوبہ سازوں نے خود امت مسلمہ کے دانشوروں اور نئی نسلوں کے ذہن پر جو برے اثرات ڈالے ہیں اس کے تدارک کی بھی وہی تدبیر ہے جو اوپر کے نکتے کے جواب میں بیان کی گئی ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- مستشرقین اور یورپی منصوبہ سازوں نے بلاشبہ امت مسلمہ کے دانشور طبقہ اور نئی نسل کو کسی حد تک متاثر کیا ہے، اس کے لیے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے کہ اسلام میں حقوق انسانی کی تعلیمات کو عام کیا جائے- جہاد و دہشت گردی کے فرق کو واضح کیا جائے اس سلسلہ میں مختلف طبقات کے درمیان مذاکراتی مجالس، سوال و جواب اور سیمینار و سمپوزیم کی مجلسوں کا اہتمام ہونا چاہیے- سب سے اہم بات یہ ہے کہ مستشرقین اور فکری پراگندگی کے حامل لٹریچر اور شخصیات سے بالاتر ہوکر کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت ہونی چاہیے اور ایسے ہی لوگ اس طبقہ کی نمائندگی کریں جو شریعت کو براہ راست اس کے مصادر سے سمجھتے اور جانتے ہوں-

سوال:- (۱۰) اگر کسی جگہ اپنی شرائط کے پیش نظر جہاد صحیح ہو تو اس کے نفاذ کی ذمہ داری عوام پر عائد ہوتی ہے یا اسلامی مملکتوں کے سربراہوں پر؟ اگر جہاد کے نام پر شروع کی گئیں سرگرمیاں صحیح نہ ہوں تو مملکتوں کے سربراہوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- جہاد کے حکم و نفاذ کی بنیادی ذمہ داری اولوالامر کی ہے جس میں علماء و امراء دونوں شامل ہیں- ان کے ہوتے ہوئے عوام کو اس طرح کا فیصلہ لینے کا اختیار نہیں- جس ملک کے کچھ شہری بطور خود جہاد بمعنیٰ قتال کی حرکت کریں اور اپنے ملک یا اس سے باہر کے امن و امان کے لیے خطرہ بن جائیں تو علماء و حکام اور سربراہ ان کو راہ راست پر لانے کی مناسب حکیمانہ تدبیریں کریں اور اگر وہ اپنی تباہ کن حرکتوں سے باز نہ آئیں، بے قصور و غیر متعلق عوام کو اپنے تشدد کا نشانہ بنانے کی کارروائی جاری رکھیں تو پھر ان کے خلاف تعزیراتی قدم اٹھا کر انہیں قابو میں لایا جائے-

مولانا وحیدالدین خاں:- میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں کسی بھی مقام پر (جہاد بمعنیٰ قتال) کی شرائط پوری نہیں ہورہی ہیں اور اگر بالفرض کسی مقام پر یہ شرائط پوری ہورہی ہوں تب بھی غیر حکومتی تنظیموں کے لیے جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں- کسی کے نزدیک اگر مسلم حکومتیں اپنا فرض پورا نہ کررہی ہوں تو تب بھی اس عذر کو لے کر کسی کے لیے بطور خود جہاد چھیڑ دینا جائز نہ ہوگا- ایسی حالت میں عام مسلمانوں کے لیے صبر ہے نہ کہ خود سے جنگ چھیڑنا-

قرآن کے مطابق، جہاد وہ ہے جو فی سبیل اللہ ہو مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان جو جہاد کررہے ہیں وہ سب کا سب فی سبیل القوم ہے- وہ منفی جذبہ کے تحت کیا جانے والا عمل ہے نہ کہ مثبت جذبہ کے تحت کیا جانے والا عمل- یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے-

مولانا شفیع مونس:- اگر کسی جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے تمام شرائط پورے ہورہے ہوں اور متعلقہ آداب بھی ملحوظ خاطر ہوں تو مسلمان حکومتوں اور آزاد جمعیتوں کو اپنی ذمہ داری حکمت و دانائی اور توکل و استقامت کے جذبے سے ادا کرنی چاہیے- اگر جہاد کے نام پر شروع کی گئیں سرگرمیاں صحیح نہ ہوں تو مملکتوں کے سربراہوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے عوام کو ان کی غلطی پر متنبہ بھی کریں اور غلطی سے باز آجانے پر مجبور بھی کریں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- شرعی حدود کے نفاذ اور نفاذ جہاد کی ذمہ داری ایک شرعی فریضہ ہے جو شرعی سربراہ مملکت کے ذریعہ ہی نافذ العمل ہوسکتا ہے-

سوال:-(۱۱) سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحانات کیا رہا ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہندوستانی مدارس اسلامیہ صدیوں سے اپنے دینی وعلمی کاموں میں مصروف ہیں- ان کا اصل مشغلہ درس وتدریس، وعظ ونصیحت اور تبلیغ وہدایت ہے- مختلف مکاتب فکر کے چھوٹے بڑے مدارس ہزاروں کی تعداد میں ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جو عام مسلمانوں کے مالی تعاون وامداد سے اپنے مصارف واخراجات پورے کرتے ہیں- اپنے وطن اور ملک کے تعلق سے ان کا فکری رجحان وہی ہے جو ایک عام ہندوستانی مسلمان کا ہے کہ اپنے ملکی مفاد کا تحفظ کرو، اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لو، دل سے اسے چاہو اور پیار کرو اور ملکی وحدت وسالمیت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اٹھاؤ- یہی وجہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کے لیے یہ مدارس پرامن بقائے باہم کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور یہ مدارس نہ سماج کے لیے اور نہ ہی ملک کے لیے کبھی کوئی پریشان کن مسئلہ بنے، بلکہ سماجی وملکی مسائل کی گھتیاں سلجھانے میں ان مدارس نے ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا-

مولانا وحیدالدین خاں:- سماجی مسائل کے بارے میں مدارس اسلامیہ کا بظاہر کوئی فکری رول براہ راست نہیں ہے- اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ مدارس اسلامیہ کے سامنے شعوری طور پر سماجی فلاح کا کوئی نقشہ موجود تھا- تاہم اس سلسلہ میں بالواسطہ طور پر ان کی خدمات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے- مثلاً فتاویٰ کے ذریعہ رہنمائی، مساجد میں خطاب جمعہ، عوامی جلسہ میں خطاب، مختلف تقریبات کے دوران اساتذہ اور طلبہ کا عوام سے انٹرایکشن، شادی بیاہ جیسی رسموں میں شرکت کے دوران وعظ ونصیحت اور رسالوں کے ذریعہ تعلیم ونصیحت وغیرہ- سماجی اعتبار سے ایک مستقل کام سوشل سروس ہے، مگر مدارس میں غالباً سوشل سروس کا کوئی باقاعدہ تصور موجود نہیں-

مولانا شفیع مونس:- سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحان یہ رہا ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم بھی ہو اور صحیح تربیت بھی تاکہ وہ سن بلوغ کو پہنچ کر مسلم ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کرسکیں- مدارس کی دینی ومعاشرتی حیثیت نہایت درجہ اہم ہے- ان کا بہتر سے بہتر نظم وانصرام ہونا چاہیے، اس کے بغیر کوئی دوسری صورت

نہیں ہوسکتی، جس سے صحیح معنوں میں بچے اور بچیوں کی دینی تعلیم وتربیت کی جاسکے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- سماجی سطح پر ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے رجحان کو مزید واضح اور عملی طور پر باکردار بنانے کی ضرورت ہے-

سوال:-(۱۲) اب تک ہندوستان کے مدارس میں دہشت گردی کی فکری یا عملی تعلیمات کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باوجود ملکی سطح پر کچھ حلقے مدارس اسلامیہ پر مسلسل دہشت گردی کے فروغ کے الزامات عائد کیے جارہے ہیں، آخر اس کے اسباب وعوامل کیا ہوسکتے ہیں؟ اور اس ڈھٹائی کے پیچھے ان کے کیا مقاصد پنہاں ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہندوستانی مدارس کے خلاف سنگھ پریوار (آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بھاجپا وغیرہ) کے شور وغوغا اور انہیں دہشت گردی کا اڈہ کہنے کا ایک سیاسی اور ظاہری سبب تو یہ ہے کہ جب افغانستان میں امریکہ مخالف طالبان حکومت قائم ہوئی تو امریکی مشنری جس نے روس کے خلاف نبرد آزما مجاہدین کی بے پناہ مالی وعسکری مدد کی تھی اس نے زوال روس کے بعد اپنا مقصد پورا ہوتا ہوا دیکھ کر افغانستان سے بے رخی برتنی شروع کردی تھی، وہ فوراً متحرک ہوئی اور مدارس کو طالبان کا سرچشمہ قرار دینا شروع کردیا کہ یہ سارے طالبانی پاکستانی مدارس کی پیداوار ہیں- اس الزام کو ہندوستان میں سنگھ پریوار نے دہرانا شروع کیا-

یہ بات اگر کسی حد تک صحیح بھی ہو تو افغانستان اور پاکستان جو مسلم ممالک ہیں ان کے حالات ومعاملات الگ ہیں- وہاں ایسا کرنے کے کچھ امکانات اور اسباب بھی ہیں جو ہندوستان میں قطعاً نہیں ہیں- اپنا ہندوستان جو ایک جمہوری اور ہندو اکثریتی ملک ہے اس کے سیاسی حالات ان دونوں ممالک سے مختلف ہیں اور اس طرح کی سرگرمیوں کی یہاں گنجائش بھی نہیں ہے- ہاں! کشمیر جو ایک مسلم اکثریتی صوبہ اور ساتھ ہی سرحد سے متصل علاقہ ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا-

باقی ہندوستان میں اب تک کوئی چھوٹا سا بھی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا کہ کسی بھی مدرسہ کی میجنگ باڈی یا ٹیچر اسٹاف یا اسٹوڈنٹس یونین کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث پائی گئی ہو-

اس لیے ان کے خلاف شکوک وشبہات کا اظہار اور ان کی وفاداری وطن پر سوالیہ نشان لگانا خود اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی شرانگیز وفتنہ خیز ذہنیت کارفرما ہے-

یہ مدارس نہ دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں نہ ہی یہ دہشت گردی کے اڈے ہیں، البتہ ایسا الزام لگانے والی مسلم دشمن تنظیمیں ضرور دہشت گردی کا ارتکاب کرتی رہتی ہیں جس کے اسباب وعوامل یہ ہیں-

یہ مدارس مسلم معاشرہ کے لیے پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان پر شب خون مارو- یہ مدارس مسلم بچوں کو اسلامی تعلیم سے آراستہ کر کے انہیں سچا پکا مسلمان بناتے ہیں اس لیے ان پر ناروا حملے کرتے رہو- یہ مدارس سارے مسلمانوں کی تہذیبی وملی شناخت کا اہم مرکز ہیں اس لیے ان کی بنیاد پر ضرب لگاؤ- اردو زبان انہیں مدارس کی بدولت کافی حد تک مستحکم ہے اور روز بروز فروغ پاتی جارہی ہے اس لیے اس مرکز کو تاخت وتاراج کرڈالو وغیرہ وغیرہ-

مولانا وحیدالدین خاں:- یہ صحیح ہے کہ مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم وتربیت نہیں دی جاتی، اس اعتبار سے مدارس پر الزام لگانا غلط ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ صحیح ہے کہ مدارس کے نظام میں عین وہی ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے- مدارس کے لوگوں کو امت مسلمہ کے مسائل میں پرامن عمل کا کوئی شعور نہیں- وہ دور جدید کے اس امکان سے بے خبر ہیں کہ ہر میدان میں حصہ داری (Sharing) کے اصول پر کام کیا جانا چاہیے- مدارس کے لوگ اب تک شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ کافر ہیں، غیر مسلم ممالک دارالکفر یا دارالحرب کی حیثیت رکھتے ہیں- یہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور سازش میں مشغول ہیں- یہی وجہ ہے کہ مدارس کی طرف سے اب تک جہاد کے نام پر متشددانہ سرگرمیوں کی کھلی مذمت نہیں کی گئی اور نہ یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سرگرمیاں جہاد نہیں ہیں بلکہ فساد ہیں- ایسی حالت میں مدارس کو اس معاملہ میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہا جاسکتا-

مولانا شفیع مونس:- اسلامی مدارس کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے وہ قطعی طور پر

غلط اور بے بنیاد ہے اور اس کے مقاصد بھی نہایت مذموم اور قابل نفرت ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- ان الزامات کی بوچھار کے اسباب اور الزامات کی وجہ بالکل واضح ہے کہ امت کو اس کے اصل سرچشمۂ علم ومعرفت سے الگ کردیا جائے- افراد امت کا رشتہ اس کے پاور ہاؤس سے کاٹ دیا جائے - مدارس نہیں رہیں گے تو اعدائے اسلام کو اپنے باطل نظریات کی اشاعت میں آسانی ہوگی اور مدارس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی بے راہ روی کی درستگی کرنے والے آہستہ آہستہ مفقود ہوجائیں گے اور انہیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جب تک یہ مدارس زندہ پائندہ رہیں گے مسلمان مستحکم ہوں گے اور اعدائے اسلام اپنے باطل افکار ونظریات کی اشاعت میں کامیاب نہ ہوسکیں گے-

سوال :- (۱۳) مدارس اسلامیہ کو اپنے وقار کے تحفظ اور ان سازشوں کے نتائج سے بچنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- مدارس اسلامیہ کو اپنے نصاب تعلیم وتربیت کو مزید جامع ومؤثر بنا کر اپنی کارکردگی بہتر سے بہتر بنانی چاہیے، علم واخلاق کا بلند نمونہ پیش کرنا چاہیے- کسی مشکوک ومشتبہ شخص کو اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہیے- اپنا حساب وکتاب ہمیشہ درست رکھنا چاہیے- عام مسلمانوں کے درمیان اصلاح کردار وعمل کی کوشش تیز تر کردینی چاہیے- اپنے طلبہ کو محنت وریاضت، نظم وضبط اور نفاست ونظافت کا عادی بنانا چاہیے- ان کے اندر ذوق مطالعہ، بلندیٔ نگاہ اور فکر مستقبل کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے اور قوم وملت ومعاشرہ وملک کے حق میں اپنے آپ کو بہتر اور پرکشش شکل میں پیش کرنے کا ان کے اندر جذبہ پیدا کرنا چاہیے-

ان جوابات کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ جہاد کے ساتھ اس کے کئی متعلقات کی بھی تصویر صاف ہوجاتی ہے- جہاد کو دہشت گردی اور ٹیررزم کہنا خود ایک بہت بڑی دہشت گردی ہے- اسرائیل پوری سنگ دلی کے ساتھ فلسطینیوں کا جس طرح قتل عام کرتا ہے اور امریکہ نے مسلم ممالک کے گرد جس طرح کا محاصرہ کر رکھا ہے اور بلا ثبوت وجواز کے فوجی عسکری اقدامات کرتا رہتا ہے یہ دور حاضر کی بین الاقوامی تباہ کن دہشت گردی ہے اور دنیا

کے انصاف پسند ممالک کو اس دہشت گردی کا کھل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور انہیں لگام دینے کے لیے ہر ضروری ومفید اور جائز ومسلسل جدوجہد کا آغاز کر دینا ہی اقوام عالم کے مفادات کا تقاضا ہے، جس سے غفلت برتنا پوری دنیا کے لیے عظیم خسارہ وبحران کا باعث ہوگا-

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک سازش کا تصور محض ایک مفروضہ ہے- اسی طرح وقار کے تحفظ کا سوال بھی ایک فرضی سوال ہے- اس کا سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہر مدرسہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے- اگر مذکورہ مفروضہ درست ہوتا تو مدارس کی یہ ترقیاں ہرگز ممکن نہ ہوتیں- اس معاملہ میں مدارس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ سازش کے فرضی وہم سے باہر آجائیں اور معتدل ذہن کے تحت اپنا کام کریں-

مدارس اسلامی تعلیم کا مرکز ہیں- اسلامی تعلیم اپنے آپ میں پرکشش ہے- وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اپنے زور پر انسان کو اپنا گرویدہ بنا سکے- اسی حالت میں موجودہ زمانہ میں مدارس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں وہ اصلاً خود مدارس کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہیں- اس کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے لوگ اپنی روایات کے تحت بند ماحول میں رہتے ہیں، وہ خارجی دنیا سے اختلاط نہیں کرتے- اس بنا پر ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ وہ نہ آج کی دنیا کو جانتے ہیں اور نہ جدید حالات کے مطابق اپنے ذہن کو تیار کرتے، اس علیحدگی پسندی کی بنا پر ان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے- اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ مدارس کے ماحول کو بدلا جائے اور قدیم کے ساتھ جدید کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے-

مدارس کو یا امت مسلمہ کو موجودہ زمانہ میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں- ان کا سبب دراصل اس بنیادی خامی تک جاتا ہے کہ مدارس میں جو سوچ دی جاتی ہے وہ بجائے خود درست نہیں- اسی فکری خامی کے نتیجہ میں وہ تمام چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن کو مسائل کا نام دیا جاتا ہے- مسائل کا لفظ بظاہر خارجی اسباب کی طرف اشارہ کرتا ہے حالانکہ ہمارے مسائل تمام تر داخلی اسباب کا نتیجہ ہیں-

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ملت کے موضوع پر ہزاروں کتابیں شائع ہوئی ہیں- عرب دنیا کے امیر شکیب ارسلان کی کتاب **لماذا تاخر المسلمون و تقدم**

غیر هم اور برصغیر ہند کے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** جیسی بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہیں- اب سب کا مشترک انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا مطالعہ عروج اور زوال کی اصطلاحوں میں کیا گیا ہے-

مطالعہ کا یہ طریقہ بلاشبہہ غیر قرآنی ہے- قرآن کے مطابق عروج اور زوال دونوں اضافی ہیں- قرآن کے نزدیک دونوں حالتیں ہیں- یہ دونوں ہی کسی قوم کے لیے امتحان (Test) کے پرچے ہیں- خدا کبھی کسی قوم کو غالب کرتا ہے اور کبھی اس کو مغلوب کر دیتا ہے- دونوں صورتوں میں یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ قوم جب کسی حالت میں مبتلا ہوئی تو اس نے کسی قسم کا رسپانس پیش کیا-

مولانا شفیع مونس:- مدارس اسلامیہ کی ایک طرف تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تعلیم وتربیت کا بہتر سے بہتر انتظام ہو اور دوسری طرف برادران وطن کے لیے دروازے کھلے ہوں جو غلط متعصّبانہ ذہن نہیں رکھتے اور اپنی معلومات کے نتائج سے ہمدردانہ انداز میں صحیح طور پر ان لوگوں کو آگاہ کریں جو تعصب اور بدنیتی کی بنا پر فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو اپنے پیغام عمل اور جدوجہد پر پختہ یقین ہونا چاہیے اور اس کی پختگی کے لیے مزید کوششیں جاری رکھنی چاہئیں، غلط پروپیگنڈہ سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیے- البتہ اس سلسلہ میں مدارس اسلامیہ کے دروازوں کو دوسروں کے لیے کھول دینا چاہیے تاکہ وہ خود آکر ان مدارس کی کارکردگی، سرگرمی اور جدوجہد کا جائزہ لے سکیں اور سماج کے تئیں ان کی خدمات کو محسوس کر سکیں- اس کے لیے علاقہ کے مختلف غیر مسلم اہل فکر ودانش، سماجی کارکنان، سیاسی اور عملی شخصیات کو گاہے بگاہے دعوت دے کر ان کے سامنے طلبہ کی علمی صلاحیتوں ولیاقتوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے، نیز ایسے ڈائیلاگ اور مذاکراتی پروگرام پیش کرنے چاہئیں جس سے ان کے سامنے اسلامی تعلیمات کی وضاحت اور اچھے اقدار کی نمائندگی ہو سکے- **واللہ الموفق**-

مولانا کلب جوادنقوی:-

شیعوں کے سرکردہ عالم ورہنما مولانا کلب جوادنقوی (لکھنؤ) کے پاس بھی جہاداور دہشت گردی سے متعلق مذکورہ سوالات بھیجے گئے تھے مگر انہوں نے ان سوالات کے جواب میں مندرجہ ذیل تحریر روانہ کی-(خ-نورانی)

اسلام کے خلاف دشمنان اسلام ہمیشہ صف آرار ہے ہیں اوران کا سب سے خطرناک ہتھیار اسلام کی تصویر مسخ کرنے کے لیے غلط پروپیگنڈہ رہا ہے- پہلے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے یہ ہتھیار محدود پیمانے پر استعمال ہوتا تھا،لیکن آج الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے اس اسلحہ کو انتہائی خطرناک حد تک وسعت مل گئی ہے،آج کل سب سے زیادہ جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے وہ اسلام کے انتہائی مقدس اور پاکیزہ فریضہ اورعبادت ''جہاد'' کے خلاف ہے- ذہنوں میں زہر گھولا جارہا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے جس میں حکم ہے کہ غیر مسلموں کو جہاں پاؤ قتل کردو- جہاد کا معنی قتل کرنا نہیں ہے،قتل اور جنگ کے لیے قرآن مجید میں لفظ قتال استعمال کیا گیا ہے- جہاد ''جہد'' سے بنا ہے جس کے معنی محنت یا مشقت کے ہیں اوراصطلاح میں اپنی ساری توانائیاں اور طاقتوں کو اعلائے کلمہ اسلام اوراللہ کی راہ میں خرچ کردینے کا نام جہاد ہے- اسلام کی سربلندی کے لیے اور اللہ کی راہ میں طاقت کا صرف میدان میں بھی ہوسکتا ہے اور بند کمرے میں بھی- جہاد ایک عنوان عام ہے جس میں قتال شامل ہے، خداوند عالم نے انسان کو فقط بازوؤں کی طاقت نہیں دی ہے، لہٰذا جہاد کا دائرہ صرف بازوؤں کی طاقت کے استعمال تک ہی محدود نہیں رہے گا- انسان کو بولنے کی طاقت، انگلیوں کو لکھنے کی طاقت، نفس کو جذبات اور خواہشات سے مقابلہ کرنے کی طاقت، ذہن و عقل کو سوچنے اور فکر کی طاقت، قدرت کی عطا ہوتی ہے- انہیں سب طاقتوں کا اللہ کی راہ میں استعمال کا نام جہاد ہے- قرآن مجید فرماتا ہے '' **وجاھدوا باموالھم وانفسھم** ''تو مال کے ذریعہ بھی جہاد ہوتا ہے یعنی اللہ کی راہ میں مال کو صرف کرنا بھی جہاد ہے- اسی طرح رسول کا ارشاد ہے'' **الکاد لعیالہ کالمجاھد فی سبیل اللہ** ''اپنے خاندان اور متعلقین کے لیے رزق کا حصول بھی جہاد ہے- اگر کسی نے اندھیرے میں ایک شمع بھی روشن کردی تو یہ

اندھیرے کے خلاف جہاد ہے، کسی نے اسکول یا مدرسہ قائم کیا تو یہ جہالت کے خلاف جہاد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو نظر میں رکھتے ہوئے جو کام بھی ہو وہ جہاد ہے، کیونکہ جہاد اپنی توانائیوں کو راہ الٰہی میں صرف کردینے کا نام ہے- اب اگر میدان جنگ میں جانا پڑے اور اسلحہ سے جنگ ضروری ہوجائے تو یہ رہِ جہاد کی قسم ہے، جسے قرآن مجید نے قتال کے لفظ سے یاد کیا ہے- اگر جہاد صرف تلوار سے ہوتا تو عورتیں جہاد کے مقدس فریضہ سے محروم رہ جاتیں-

اسلام میں بحالت مجبوری اور دفاعی ضرورتوں کے لیے اسلحہ اٹھانے کی اجازت ہے، اسی لیے قتال کے سلسلے میں جو پہلی آیتیں نازل ہوئیں وہ بعثت رسالت مآب کے تقریباً ساڑھے چودہ سال بعد- پہلی آیت ''**اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا**'' نازل ہوئی جس کا مطلب ہے ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ جاری ہے اور کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے- اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور ان سے جنگ چھیڑی گئی ہے تو آیت کریمہ خود بتارہی ہے کہ جنگ کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوتی ہے بلکہ دشمنان اسلام کی طرف سے، اسی طرح دوسری آیت کریمہ ہے'' **وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا** ''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہیں اور دیکھو جنگ میں حد سے آگے نہ بڑھنا - یہ آیت بھی ثابت کر رہی ہے کہ جنگ کی ابتدا کافروں کی طرف سے ہوتی ہے اور مسلمانوں کو دفاع کا حکم دیا جارہا ہے، یہ آیت بتارہی ہے کہ کس راہ میں لڑو، کس سے لڑو اور کس حد تک لڑو- اسلام میں جنگ کی ابتدا کی اجازت نہیں ہے اور رسول اسلام کی جتنی جنگیں تھیں وہ سب دفاعی تھیں- اگر اسلام کے اس اصول کو ساری دنیا تسلیم کرلے کہ جنگ میں ابتدا نہیں ہوگی تو دنیا سے جنگ کی لعنت خود بخود ختم ہوجائے گی-

'' **لاتعتدوا** '' کا قرآنی حکم مسلمانوں کو پابند کررہا ہے کہ دفاع بھی کریں تو صرف اتنا کہ جتنی ضرورت ہے اور طاقت کا استعمال بھی صرف اس حد تک کہ فتنہ دفع ہوجائے- حکم ہے کہ کسی کنبہ کو نہ مارو، زخمیوں کو قتل نہ کرو، خواتین کا احترام کرو، مذہبی لوگوں کو قتل نہ کرو، کھیتیاں اور درخت تباہ نہ کرو اور اگر مقابلہ کرنے والے صلح پر راضی ہوجائیں تو تم بھی صلح کرلو- اس

کا مطلب ہے اسلام میں جنگ بحالت مجبوری ہے اور اسلام صلح وامن کا مذہب ہے-

اسلام میں کسی اچھے سے اچھے اور نیک سے نیک کام کے لیے بھی کسی بے گناہ کے خون کا ایک قطرہ بھی بہانا جائز نہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو- یہ کمیونزم کا نظریہ ہے کہ صرف ہدف اور مقصد صحیح ہو تو حصول کے لیے صحیح غلط ہر طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے- لیکن اسلامی نظریات کے مطابق ہدف بھی صحیح ہونا چاہیے اور ہدف کو حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ بھی جائز ہونا چاہیے- لہذا جو تنظیمیں دشمنان اسلام کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کو ہمیشہ یہ اسلامی حکم پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کبھی جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو اپنے حملوں کا نشانہ نہیں بنائیں- اسلام میں صرف گنہگار کو سزا ہے، کسی گنہگار کے بدلے میں کسی بے گناہ کا ایک قطرہ خون بہایا نہیں جا سکتا- آج جو بم کے دھماکے ہوتے ہیں ان میں عموماً عوام نشانہ بنتے ہیں جس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ دشمنان اسلام کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کا زبردست مواد مل جاتا ہے اور عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو مسلسل ٹیلی ویژن پر دکھا کر اسلام کے خلاف نفرت کا زہر پھیلاتے ہیں-

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میڈیا پر اسلام دشمنوں کا قبضہ ہے، اس لیے جو مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے اسے میڈیا میں چھپایا جاتا ہے، لہذا اس وقت، وقت کی سب سے بڑی ضرورت مسلم میڈیا کا قیام ہے- کروڑوں عربوں ڈالر یورپ اور امریکہ میں عیاشی پر صرف ہو جاتے ہیں- ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف زبانوں میں ٹی وی چینل اور اخبارات مسلمانوں کی طرف سے ہوں تاکہ دشمنان اسلام کے غلط پروپیگنڈے کا مؤثر توڑ ہو سکے-

مولانا انظر شاہ کشمیری:-

دیوبندی جماعت کے رہنما اور دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری کے پاس بھی مذکورہ سوالات روانہ کیے گئے تھے، مگر انہوں نے ساری ذمہ داری دار الافتاء پر ڈال کر جواب دینے کا عذر پیش کیا اور مندرجہ ذیل تحریر بشکل مراسلہ روانہ کی- (خ-نورانی)

مکرمی! سلام مسنون

مرسلہ سوالات کے بیشتر جواب دار الافتاء سے متعلق ہیں، مگر وہاں ایک ہفتہ جواب کے لیے درکار ہوگا، اگر آپ فرمائیں تو دار الافتاء بھیج دوں-

مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ جہاد نہیں ہے بلکہ اپنے جان و مال کی حفاظت، اہل وعیال، عزت وآبرو کا تحفظ، تعلیمی ترقی، معاشی استحکام، اپنے مستقبل کی تعمیر نو کی فکر، یہ سب امور امن وسکون کے طالب، اکثریت سے خوش گوار تعلق، ملک کو اپنا وطن سمجھنا اور اس کے برے بھلے کی فکر وغیرہ میں ہے، یہ بھی گزارش ہے کہ غیر ضروری بلکہ خلاف مصلحت سوالات ملت کی پسماندگی اور درماندگی کے لیے داروئے شفا نہیں، بلکہ ہلاکت میں مبتلا کرنا ہے جو ملت کے واقعی غم خوار سے ممکن نہیں-

(۲) مدارس کے سلسلہ میں ہمیشہ جدید طبقہ یہ کہہ کر مطعون کرتا رہا کہ ناکارہ پیدا کیے جا رہے ہیں، قل اعوذیوں کی فصل بوئی جا رہی ہے، مسجد میں صفیں بچھانے والے، اذان اور نماز پڑھانے والے تیار کئے جا رہے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، بلکہ وہ ملت کے لیے بوجھ ہیں، کاش کہ اب معترضین کی آنکھیں کھلیں اور ان نکتہ چینیوں کا دروازہ بند ہو، اگر یہ مدارس اتنے ہی مفلوج اور بے کار تھے جتنا سمجھا گیا اور سمجھایا گیا تو آج دانا دشمن اسے شہ رگ سمجھ کر حملہ آور نہ ہوتا، علاج اس کا صرف یہ ہے کہ ان مدارس کو مستحکم کیا جائے اور مدارس مخالف طبقہ کو مدارس کے نظام کا قریبی مطالعہ کا موقع دیا جائے، مدارس اپنے جلسوں میں سیکولر افراد کو برابر بلائیں، وہ جو کچھ ہمارے اسٹیج سے کہیں گے وہ ہمارے لیے مضبوط شہادت ہوگی، تمام مدارس متفقہ طور پر مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کا مثبت جواب دیں، لیکن یہ سب کچھ اپنے دین، اپنا تشخص، اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے اپنی مفید روایات کو سنبھالتے ہوئے- ایسا ہرگز نہ ہو کہ اس میل ملاپ میں وہ عبرت ناک منظر سامنے آئے کہ ''ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد'' اس اہم نکتہ کو نہ بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمان موجودہ حالت میں موثر کردار تو پیش نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی غنیمت ہوگا کہ کم از کم غیر ضروری حد تک متاثر نہ ہو-

❑❑❑

اجتہاد وتقلید

مسئلہ اجتہاد وتقلید انہی مسائل میں ہے جن کو سمجھے بغیر ہر کوئی اظہار خیال کرنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے- اگر اس مسئلے میں ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی جیسے افراد امت کے اجماعی موقف سے الگ راہ نکالنے کی کوشش کریں، تو ان کے ذاتی دینی مطالعے کے پیش نظر انہیں نظر انداز بھی کر دیا جائے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ آج ہر بالشتیہ جسے نہ فقہ وحدیث کے معنی معلوم ہیں اور نہ قیاس واجتہاد کا مفہوم، آستین چڑھائے منصب اجتہاد پر براجمان ہونے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے، جس کے نتیجے میں ۹۵ رفی صد یا اس سے زائد افراد مقلدین وغیر مقلدین کے اصل اختلاف سے ناواقف ہیں- اسی ناواقفی کو ختم کرنے اور معلومات وحقائق عام کرنے کے لیے ہم نے اپریل ۲۰۰۶ء میں جام نور کا ۳۰۰ رصفحات پر مشتمل خصوصی شمارہ ''اجتہاد و تقلید'' شائع کیا اور مختلف مکاتب ومسالک کی سرکردہ ذی علم وفہم شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے، تاکہ اجتہاد وتقلید پر پڑے جہالت کے دبیز پردے چاک ہوں اور حقیقت عوام کے حضور بے نقاب ہو جائے- عصر حاضر کے اس متنازع ترین موضوع کے تعلق سے ۱۵ رسوالات پر ترتیب وار جن چار شخصیات کے جوابات حاضر ہیں وہ یقیناً معاصر مذہبی وعلمی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں اور ان کی باتوں کا بہر حال اپنے اپنے حلقوں میں وزن اور اعتبار ہے- یہ چار نام یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

(۲) مولانا عبدالوہاب خلجی، سابق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی

(۳) مولانا وحید الدین خان، صدر اسلامی مرکز دہلی

(۴) مولانا عبدالحمید نعمانی، سکریٹری وترجمان جمعیۃ العلما ہند، دہلی-

یہ یقینی بات ہے کہ ہر شخص بیک وقت ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن ہمارا وجدان ہے کہ طالب حق کی نیت اگر درست ہو تو اسے حقیقت کا سراغ مل ہی جاتا ہے-

سوال (۱):- قیاس واجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت کیوں پڑی؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- قیاس کا لغوی معنی اندازہ کرنا اور برابری دکھانا اور فقہا کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ جو حکم کسی امر کے لیے کسی علت کی بنیاد پر نص سے ثابت ہے وہی حکم اسی علت کی بنیاد پر دوسرے ایسے امر کے لیے ثابت کرنا جس کے بارے میں نص وارد نہیں-

اجتہاد کے لغوی معنی کوشش ومحنت صرف کرنا اور فقہا کی اصطلاح میں فقیہ کا کسی حکم شرعی نظری کے استخراج کے لیے پوری طاقت صرف کرنا- کتاب وسنت سے بے واسطۂ قیاس استخراج احکام پر بھی اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے اور منصوص کی روشنی میں علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعہ غیر منصوص کا حکم نکالنے کو بھی قیاس کہا جاتا ہے-

قیاس کے ارکان وشرائط کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں خاص طور سے بتانے کی بات یہ ہے کہ قیاس کسی ایسے ہی معاملہ میں ہوسکتا ہے، جس کا حکم کتاب وسنت میں صراحۃً بیان نہ ہوا ہو، ائمہ کرام نے قیاس سے اسی وقت کام لیا ہے، جب کتاب وسنت، اجماع امت یا فقہاے صحابہ کے اقوال سے مسئلہ کا حل دست یاب نہ ہوا ہو-

کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے قیاس واجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف اصول وکلیات اور بعض جزئیات صراحۃً بیان ہوئے ہیں، اصول کی روشنی میں فروع کا بیان اور جزئیات کی تفصیل قرآن نے بیان رسول اور فکر مجتہدین کے سپرد کردی ہے، ارشاد ہے: **وأنزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون** (سورہ نحل آیت ۴۴) ''اور اے رسول ہم نے تم پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ لوگوں کے سامنے تم اسے واضح کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور کہیں وہ خود بھی فکر کریں''-

واقعہ بھی یہی ہے کہ احادیث کریمہ میں اگرچہ بے شمار احکام اور اصول وفروع کا ذکر

ہوا، پھر بھی عہد صحابہ سے ہی روز بروز ایسے مسائل پیش آتے رہے جن کا جواب صحابہ کرام کو بھی حدیث نبوی میں نہ ملا اور قیاس واجتہاد کا سلسلہ جاری ہوا، یعنی منصوص کی روشنی میں غیر منصوص امور کے احکام کا استخراج ہونے لگا-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- **قیاس**: ادلہ شرعیہ میں چوتھے نمبر کی دلیل ہے- فرع، اصل، علت اور حکم اس کے ارکانِ اربعہ ہیں- جب کسی مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت مصطفےٰ ﷺ اور اجماع سے دلیل ثابت نہ ہو تو قیاس حجت شرعی ہوتا ہے- بشرطیکہ قیاس کسی نص یا اجماع سے متصادم نہ ہو نیز جس اصل پر فرع کو محمول کیا جارہا ہے وہ اصل، نص یا اجماع سے ثابت ہو- قیاس پر قیاس صحیح نہیں ہے، نیز علت اور حکم کے درمیان شرعی طور پر معتبر اور مناسب معنی پایا جاتا ہو- اسود اور ابیض جیسے طردی اوصاف علت نہیں ہوسکتے- تفصیل کے لیے کتبِ اصول کا مراجعہ کیا جائے-

اجتہاد: کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے، غایت درجہ کوشش صرف کرنے کا نام ہے اور اس قسم کے جُہد صرف کرنے والے کو مجتہد کہا جاتا ہے- بشرطیکہ وہ اپنے اجتہاد کے لیے ضروری حد تک ادلہ شرعیہ سے واقف ہو، مثلاً آیاتِ احکام، احکام سے متعلق احادیث اور ان کی صحت وضُعف کا تحقیقی علم رکھتا ہو، ناسخ ومنسوخ اور مواقع اجماع واختلاف پر پوری طرح مطلع ہو اور عربی زبان ولغت اور اصول فقہ واستنباط سے بھی بخوبی واقف ہو- ایسا شخص اگر معرفت حق کے لیے کوشش کرتا ہے اور جو رائے اس کے سامنے حق ہو کر ظاہر ہوتی ہے وہ کتاب وسنت کے دلائل اور معانی شرعیہ کی روشنی میں درست ثابت ہوتی ہے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے ورنہ اکہرے اجر کا، جیسا کہ حاکمِ وقت کے اجتہاد کے متعلق صحیحین میں عبداللہ بن عمرو اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت آئی ہے-

قیاس واجتہاد کی ضرورت: یقیناً کتاب وسنت کے دلائل سے جو شخص جس قدر زیادہ واقف ہوگا اس کو اجتہاد وقیاس کی اتنی ہی کم ضرورت پڑے گی، تاہم مسائل متجددہ ومتنوعہ کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں، بشرطیکہ مجتہدین امت اجتہاد کی بنیادی اور لازمی شرطوں سے متصف ہوں-

مولانا وحیدالدین خاں:-فقہا چار مصادر شریعت مانتے ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس- میرے نزدیک مصادر شریعت تین ہیں، کتاب، سنت اور اجتہاد، میرے نزدیک قیاس اور اجماع دونوں اجتہاد کے دو درجے ہیں- اجماع کے بغیر جو اجتہاد ہو وہ قیاس ہے اور جس اجتہاد پر عمومی اتفاق ہو جائے وہ اجماع ہے-

اجتہاد دین کی ایک فطری ضرورت ہے، کیوں کہ ساری باتیں نص میں نہیں ہو سکتیں، نص میں صرف بنیادی باتیں ہی ہوتی ہیں- نئے حالات میں ضرورت ہوتی ہے کہ منصوص احکام کا انطباق نئے حالات میں تلاش کیا جائے- اسی کا نام اجتہاد ہے- یہ اجتہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی لیے بخاری میں یہ روایت ہے کہ صحیح اجتہاد پر دگنا ثواب ہے اور اجتہادی خطا پر ایک ثواب، بشرطیکہ نیت درست ہو-

مولانا عبدالحمید نعمانی:-قرآن نے دین کے تعلق سے کہا ہے **الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً** دین مکمل ہے اور جب دین مکمل ہے تو کسی بھی شرعی مسئلے میں جس کا تعلق سماج سے ہو یا انسانی ضروریات سے ہو تو اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ہاں یا نہیں میں ملنا چاہیے- بعد کے دور میں امت کے سامنے جو مسائل پیدا ہوئے یا درپیش ہوں گے، مثال کے طور پر انشورنس کا مسئلہ ہے، شیئر کا ہے، اعضاء کی پیوندکاری کا ہے، بین الاقوامی حالات کے پیش نظر جو خارجی و داخلی سطح پر مسائل پیدا ہوئے، دوسرے فرقے سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہیے، شرعی نقطۂ نظر سے ہم دوسروں سے کہاں تک قریب ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو کہاں تک قریب لا سکتے ہیں، اسی طرح ملک و سماج کے مشترک مسائل، اب ان مسائل کے تعلق سے اگر پوچھا جائے کہ بتایئے قرآن میں یا حدیث میں ان کے تعلق سے کیا حکم ہے؟ تو ظاہر ہے کتاب و سنت کے اندر ان کی صراحت نہیں ہے، تو جب نفی یا اثبات میں ان مسائل کے تعلق سے کتاب و سنت سے جواب نہیں ملا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین مکمل کیسے ہوا؟ مکمل کا مطلب ظاہراً تو یہی ہے کہ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہو- حالاں کہ یہاں ضرورت پڑ رہی ہے- تو اب یہیں سے ہمیں سمجھنا ہوگا کہ دین کے مکمل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں سارے

مسائل صراحت سے مذکور ہیں- دین کے مکمل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن نے تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے، مثال کے طور پر کسی فرد یا قوم سے مقابلے کی بات، قرآن نے بتایا کہ اس کے لیے ایسی تیاری ہو کہ وہ مرعوب ہو جائے- اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کے اسلحہ یا وسائل جنگ مد مقابل کے پاس ہوں اس نوعیت کے اسلحے آپ کے پاس بھی ہونے چاہیے، اب اگر آپ کے مقابل کے پاس ایٹم بم ہے یا لیزر بم ہے تو آپ تلوار سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے- تو اب اگر کوئی کہے کہ قرآن نے ایٹم بم رکھنے کا حکم تو نہیں دیا ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اس کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ قرآن نے اصول بتا دیا ہے، اس اصول کی روشنی میں علم دین کے ماہرین جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے مطابق حکم دیتے ہیں- قرآن نے ایک اصول دے دیا کہ ایسی تیاری ہو کہ مد مقابل مرعوب ہو سکے اور ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں اس کے لیے ایٹم بم کی ضرورت ہے-

اس طرح کے جدید مسائل جو سامنے آتے ہیں ان میں بہر حال رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حل کی ضرورت ہوتی ہے- حل مسائل کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں- کبھی مجتہدین امت اس نئے مسئلے میں متفق ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے آپس میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے- پہلی صورت کو اصطلاح شریعت میں اجماع کہتے ہیں اور دوسری صورت کو قیاس سے تعبیر کرتے ہیں- اتفاق اور اجماع والی صورت میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ حکم واجب الاتباع ہوگا- ہاں! اختلاف کی صورت میں یہ ہوگا کہ سارے مجتہدین کا اور ان کی آراء کا احترام کیا جائے گا، لیکن ایک شخص اتباع ان میں سے کسی ایک ہی کا کر سکتا ہے- ایک وقت میں سب کی بات مان لے یہ ممکن ہی نہیں ہے-

جس طرح انبیائے کرام بہت سے ہیں اور ہم پر ہر ایک کا احترام واجب ہے، لیکن جہاں تک ماننے کی بات ہے تو ہم اپنے ہی نبی کو مانیں گے، دوسرے کو نہیں- ائمہ کی پیروی کا بھی یہی حال ہے کہ ہم احترام تو سب کا کریں گے، لیکن مانیں گے اپنے ہی امام کی-

یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ تقلید غیر منصوص مسائل میں ہی ہوتی ہے، جو مسائل کتاب و سنت میں منصوص ہیں، جیسے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے

رسول ہیں- تو ان میں ہم کسی کی تقلید نہیں کریں گے، یہ حکم تو صراحت کے ساتھ موجود ہے ہی- اسی طرح ایسے مسائل جن کی صراحت تو قرآن میں ہے لیکن الفاظ کے معنی کے تعین میں اختلاف ہو گیا، قروء ایک ہی لفظ ہے جس کا معنی کسی امام نے حیض بتایا جبکہ دوسرے نے طہر بتایا، نکاح کا اصلی معنی وطی ہے لیکن عقد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو تعین معنی میں علماء کا اختلاف ہو جاتا ہے- اب ان میں ہر ایک کی بات تو مان نہیں سکتے، کیوں کہ یہ ناممکن ہے، اس لیے کسی ایک پر اعتماد کرنا ہوگا- یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ لوگ حضور کے زمانہ سے قریب رہے، پھر دین کو ہم سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا، یہی تقلید ہے جو صرف دین ہی میں نہیں دوسری صنعت وحرفت مثلاً خیاطی، معماری وغیرہ میں کی جاتی ہے- تقلید کے حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مقلدین کتاب وسنت کے حکم کی بجائے مجتہد کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بہت بڑی چوک ہے، کیوں کہ کوئی بھی مجتہد اپنی طرف سے حکم صادر نہیں کرتا، وہ تو نص کے اندر جو پوشیدگی ہوتی ہے، اس کو ختم کر کے کتاب وسنت کے حکم کو ظاہر کر دیتا ہے- اس کی حیثیت اس شخص کی ہے جو بادام کا چھلکا توڑ کر مغز نکالتا ہے، وہ بادام پیدا نہیں کرتا، صرف چھلکا ہٹا دیتا ہے، اسی لیے اصول فقہ کی کتاب میں مجتہد کی تعریف میں آیا ہے **هو مظهر للحكم الشرعي** وہ حکم ظاہر کرتا ہے، صادر نہیں کرتا-

قرآن نے خدا ورسول کے بعد ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے، جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں اور اس کی تعبیر استنباط سے کی ہے اور استنباط مسائل ہی دراصل اجتہاد ہے، استنباط لغت میں پانی نکالنے کو کہتے ہیں اور پانی نکالنے والا پانی پیدا نہیں کرتا، بلکہ زمین کے اندر پانی موجود ہوتا ہے، بس وہ مٹی کھود کر اس پانی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، مجتہد کا عمل بھی درحقیقت اسی نوعیت کا ہے-

سوال (۲):- مجتہدین کے مختلف طبقات کے کیا معنی ہیں؟ اور کیا آج بھی مجتہدین کا کوئی طبقہ موجود ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ہر فقیہ کی علمی وسعت اور اجتہادی قوت یکساں نہیں، علمی صلاحیت اور احکام کے استخراج و بیان کے لحاظ سے فقہا میں فرق مراتب ہے، فقہا کے

طبقات اور ان کی مثال میں فقہا کے نام ذکر کرتے ہوئے، اسی فرق مراتب کو واضح کیا گیا ہے، یہ ہمارے فقہائے کرام کی دیانت وامانت ہے کہ جو فقیہ جس درجے کا تھا، اسی حد پر رہ کر اس نے اپنا کام کیا اور بعد کے فقہا نے اس فقیہ کے کام کی نوعیت اور اس کا دائرۂ عمل دیکھ کر اس کے مرتبے کا تعین کیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنا مرتبہ اپنی حیثیت سے ہزار گنا اونچا باور کر چکا ہو تو ممکن ہے اسے یہ تعین مراتب اور تفریق درجات پسند نہ آتی ہو اور اپنے کو امام اعظم کا ہم پلہ جتانے اور بالکل مساوی وہم قامت بتانے کی راہ میں اسے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہو- مگر حق یہی ہے کہ سب فقہا و مجتہدین ہم پلہ اور ہم رتبہ نہیں-

علامہ محمد امین بن عابدین شامی نے شرح عقود رسم المفتی میں فقہا کے سات طبقات ابن کمال پاشا کے حوالے سے بیان کیے ہیں-

اول: مجتہدین فی الشرع، جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے امثال جنہوں نے اصولی قواعد وضع کیے اور ادلّہ اربعہ (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) سے احکام نکالنے کے اصول مقرر کیے اور اصول وفروع میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کی-

دوم: مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور دیگر تلامذۂ امام اعظم یہ اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کے مطابق ادلۂ اربعہ سے استخراج احکام پر قادر ہوتے ہیں، یہ اصولی قواعد میں اپنے استاذ کے مقلد ہوتے ہیں اگرچہ بعض فروع میں استاذ سے اختلاف کرتے ہیں-

سوم: مجتہدین فی المسائل، یہ اصول وفروع کسی میں امام کی مخالفت کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ آئی ہو، ان کے احکام اپنے امام کے مقررہ اصول وقواعد کے مطابق استنباط کرنے پر قادر ہوتے ہیں- جیسے امام ابو جعفر طحاوی، امام کرخی، فخر الاسلام بزدوی وغیرہم-

چہارم: اصحاب تخریج، جیسے ابو بکر جصاص رازی وغیرہ، یہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن اصول سے پوری آگاہی اور مأخذ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں، اس لیے امام یا ان کے اصحاب سے منقول کسی مجمل قول کی تفصیل یا کسی محتمل حکم کی توضیح اپنی رائے اور وسعت نظر کی بنیاد پر کر سکتے ہیں-

پنجم: اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ، ان کا کام بعض روایات کو بعض دیگر روایات پر ترجیح دینا ہوتا ہے- اس کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ لاتے ہیں: **هذا اولی، هذا اصح رواية، هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرق للناس-**

ششم: اصحاب تمیز، یہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقوی، قوی، ضعیف، ظاہر الروایہ، ظاہر المذہب اور روایت نادرہ میں امتیاز کرلیں- جیسے صاحب کنز الدقائق، صاحب مختار، صاحب وقایہ وغیرہم مصنفین متون معتبرہ، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں نا مقبول اقوال اور ضعیف روایات نقل نہ کریں-

ہفتم: مقلدین، جو تمیز کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور جو پا گئے حاطب اللیل کی طرح کتاب میں جمع کردیتے ہیں، **فالويل لمن قلد هم كل الويل** -انتہی-

ہوسکتا ہے کلی نہیں تو جزوی اصحاب تمیز آج بھی موجود ہوں، اور آئندہ بھی ہوتے رہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -علمائے فقہ واصول نے مجتہدین کے متعدد طبقات ذکر کیے ہیں- کوئی مجتہد فی المذہب ہوتا ہے، کوئی مجتہد منتسب (اصولی طور پر کسی مجتہد سے متفق اور فروعات میں کلی طور پر متفق نہ ہو) اور کوئی مجتہد مطلق ہوتا ہے- الحمدللہ "**كل يعمل على شاكلته**" کے تحت مجتہدین کا ہر طبقہ کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے- یہ الگ بات ہے کہ آج کل مجتہدین اور فقہاء کا سیلاب اُمڈ آیا ہے اور شیخ الاسلام اور فقیہ العصر کے بھاری بھرکم القاب سے ملقب حضرات کی بہتات نظر آتی ہے- **والله المستعان-**

مولانا وحیدالدین خاں: -فقہا نے مجتہدین کے کئی طبقے بنائے ہیں- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غیر ضروری تطویل ہے، حقیقی معنوں میں مجتہدین کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جزئی مجتہد اور (۲) کلی مجتہد، مثلاً طبی انجکشن کا طریقہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھا، اب جو شخص انجکشن کے معاملے میں اجتہاد کرکے اس کا شرعی حکم بتائے، وہ جزئی مجتہد ہے، اسی طرح سیکولرزم قدیم زمانے میں موجود نہیں تھا- اب سیکولرزم پر اجتہاد کرکے جو اس کا شرعی حکم بتائے وہ کلی مجتہد ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -اجتہاد دراصل نو پیدا غیر منصوص مسائل کو کتاب وسنت کے

اصولی احکام کی روشنی میں حل کرنے کا نام ہے، نئے نئے مسائل زمانہ گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں تو ظاہر ہے اجتہاد کا تسلسل بھی برقرار رہے گا، اسی لیے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ اجتہاد قیامت تک ہوتا رہے گا- لیکن اس کے ساتھ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ دین کے جو عمومی مسائل ہیں، ائمہ اربعہ نے تمام مسائل کا حل پیش کردیا ہے- ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی امام اوزاعی وغیرہ دوسرے ائمہ ہوئے، لیکن ان کی فقہ مدون نہیں ہوسکی، ائمہ اربعہ کی فقہ مدون شکل میں موجود ہے، جو دین کے عمومی مسائل کے تمام جزئیات کا حل بتاتی ہے، تو یہ حضرات مجتہد مطلق ہیں اور آج کے زمانے میں نہ تو اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے لیے جس قسم کی صلاحیت درکار ہے، وہ کسی میں موجود ہے، ہمیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں، آج بھی ایسی صلاحیت کا انسان پیدا ہوسکتا ہے، لیکن موجودین میں اس کی مثال ناپید ہے- خلاصہ یہ کہ دین کے عمومی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، رہے وہ مسائل جو حالات کے بطن سے آج پیدا ہو رہے ہیں، ان میں غور وفکر اور تحقیق واجتہاد کا سلسلہ تو بہر حال برقرار رہے گا، لیکن چوں کہ آج دین کی کامل بصیرت اور نصوص پر گہری نظر رکھنے والے لوگ عنقا ہیں اس لیے یہ کام انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر ہو رہا ہے- دنیا بھر میں جو فقہی اکیڈمیاں ہیں وہ یہ کام بخوبی کر رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ انفرادی طریقہ سے زیادہ بہتر ہے-

رہی اجتہاد کے مختلف درجات کی بات تو اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے مجتہد مطلق اور مقلد مطلق کو سمجھنا ہوگا- جو کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اصول بناتا ہے اور مسائل کا استخراج واستنباط کرتا ہے، وہ کسی اور عالم کی پیروی نہیں کرتا- مجتہد مطلق کی مثال ائمہ اربعہ ہیں، وہ اصول وفروع کسی میں بھی کسی دوسرے کی پیروی نہیں کرتے- مقلد مطلق وہ ہے جس کو شریعت کا کچھ بھی علم نہیں- اس نے اہل علم سے مسئلہ سنا اور اس پر آنکھ بند کرکے عمل کر رہا ہے، یہ مسئلہ کیسے ثابت ہوا اور کون سی دلیل ہے اس کے لیے نہ تو وہ جانتا ہے اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے- ان دونوں طبقات کے بیچ میں بھی کئی طبقات ہیں جو بعض مسائل میں تو خود اپنی رائے رکھتے ہیں، مگر بعض دوسرے میں وہ امام اعظم کی تقلید کرتے

ہیں-بعد کے ادوار میں امام طحاوی، ابن ہمام وغیرہ خود مجتہد ہیں، لیکن وہ اصول میں امام اعظم کی اور مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف کی پیروی کرتے ہیں- خلاصہ یہ کہ اہل علم کو بھی اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کا اتباع کرنا پڑتا ہے- اسی سے اجتہاد کے اور مجتہدین کے مختلف طبقات سامنے آتے ہیں-

سوال (۳):-امام اعظم ابوحنیفہ اور دوسرے تینوں ائمہ کا اصل علمی کارنامہ کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ پوری امت انہی چاروں کی تقلید پر متفق ہوگئی؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-عہد رسالت اور عہد صحابہ میں لوگ قرآن وسنت کی عام ہدایات اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کاربند تھے- خلوت وجلوت میں خوف خدا، عدل، امانت، عام نصیحت وخیر خواہی، دعوت خیر، منع شر، کار خیر میں تعاون، کار شر سے کنارہ کشی وغیرہ عام اصول تھے جس پر ہدایت قرآنی مشتمل تھی، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی فضائل ومحاسن پر صحابۂ کرام کی تربیت فرمائی، جزئی امور میں صحابہ کرام کو اگر کوئی اشکال پیش آتا تو سرکار کی بارگاہ میں رجوع کرتے یا اکابر صحابہ سے معلوم کرتے، تمدن کی وسعت اور اسلامی رقبہ کے پھیلاؤ کے بعد واقعات و معاملات کی بے پناہ کثرت ہوتی گئی اور افراد بھی اچھے برے، حق کوش، ناحق کوش، عدل پرور، ظلم شیوہ ہر طرح کے پیدا ہونے لگے، ایسے ماحول میں اقامت خیر اور دفع شر کے لیے مبسوط اصول وقوانین اور مفصل جزئیات مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان قوانین کی روشنی میں افراد اپنے معاملات کی صحت وسقم کو سمجھ سکیں اور جہاں حکومت کی مداخلت کی ضرورت ہو وہاں حکومت ان قوانین کے تحت رعایا کے معاملات حل کر سکے-

اس طرف باضابطہ اور ہمہ گیر توجہ سب سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبذول فرمائی اور ایک فقہی مجلس کی شکل میں اپنے تلامذہ کو جمع کر کے مسلسل جدوجہد کی، اسی روش پر دیگر ائمہ بھی چلے اور اصول فقہ اور فقہ کی شکل میں دو مستقل فن وجود میں آئے، ان سب پر مفصل گفتگو اور مستقل تبصرہ کا موقع نہیں، مگر چند باتوں کی جانب اشارہ ہوسکتا ہے، مثلاً

(۱) ان حضرات نے کتاب وسنت اور آثار صحابہ میں نظر کر کے یہ واضح فرمایا کہ احکام

کی مشروعیت کا ہدف پانچ چیزوں (نفس، دین، عقل، مال، نسب) کا تحفظ ہے- اور سارے احکام اسی امور پر گردش کرتے ہیں-

(۲) طلب اور ممانعت کے مدارج ومقاصد اور دلالت کے احوال ومراتب پر غور کیا، یعنی کس چیز کا مطالبہ لازمی طور پر اور شدت کے ساتھ ہے، پھر اس مطالبہ سے کون سا اہم امر مقصود ہے، جس آیت سے یہ مطالبہ مفہوم ہو رہا ہے، اس کی دلالت، اس پر بہت واضح اور نمایاں ہے یا دقیق اور مبہم یا محتمل ہے، بلفظ دیگر قطعی وجزمی ہے یا ظنی واحتمالی؟ اگر حدیث سے کسی فعل کا مطالبہ سمجھ میں آرہا ہے تو خود اس حدیث کا ثبوت کس درجہ کا ہے- وہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا آحاد ہے؟ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف وغیرہ؟ پھر طلب واضح ہے یا مبہم؟ ان امور پر نظر کے نتیجے میں احکام کے بھی درجات واقسام طے ہوئے- مثلاً فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی، اساءت، مکروہ تنزیہی، خلاف اولیٰ، مباح-

(۳) اصول وقواعد کی تاسیس کے بعد جزئیات کی تفریع وتدوین کا مرحلہ آتا ہے، اس سلسلے میں فقہائے امت کی جانکاہی وعرق ریزی جاننے کے لیے فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی فہرست پر نظر ڈالیے آپ کو معلوم ہوگا کہ طہارت اور عبادات سے لے کر نکاح و معاملات، وقف، میراث، حدود وتعزیرات وغیرہ تمام ابواب سے متعلق احکام کا ذخیرہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا گیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی ایسے جامع اور مستند مجموعے پیش کرنے سے قاصر ہیں-

ائمہ اربعہ کے مذاہب پر اتفاق امت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر باب کے احکام مدون کر دیے اور بعد کے اہل نظر متبعین حالات کے مطابق ان کی تنقیح اور ان میں اضافہ کرتے رہے- عام آدمی جو خود اجتہاد واستنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا، شرعی زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا ہی مذہب اپنا سکتا ہے، جس میں ضرورت کے تمام مسائل مدون اور مرتب شکل میں موجود ہوں، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام ابن جریر طبری وغیرہم کے مذاہب مدون اور محفوظ ومنقول نہ ہوئے، اس لیے امت انہیں اپنانے بلکہ جاننے سے بھی قاصر رہی-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ ثلاثہ وغیرہم رحمہم اللہ مجتہدین امت

ہیں اوران کی کوششیں قابل ستائش، لائق استفادہ اوران شاءاللہ باعث اجروثواب ہیں،لیکن ان میں سے کسی کے لیے عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا-امام دارالہجرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے "**کل منا مأخوذ منه ومردود عليه الا صاحب هذا القبر**" (یہ قول اصلاً مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) یعنی نبی ﷺ کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی بات لی اور چھوڑی نہ جاسکتی ہو-لہٰذا امت کے کسی امام وفقیہ کے ہر قول وفتویٰ کو لائق اتباع سمجھنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، بلکہ مخالف دلیل صحیح اور نص صریح قول وعمل کا ترک کرنا واجب ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے-ائمہ اربعہ کی تقلید پر کبھی کسی دور میں اجماع منعقد نہیں ہوا-خود ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے اپنے متبعین اور تلامذہ کو سختی سے کتاب اللہ اور صحیح سنت مصطفےٰ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے- بھلا ایک غلط چیز یعنی جامد تقلید پر امت کے علما مجتہدین کیوں کر متفق ہوسکتے ہیں- (بعض فقہاء اجماع کا دعویٰ اپنے مخالف کو مرعوب کرنے کے لیے بطور ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں جب کہ تحقیق کے بعد اختلافی مسائل خلافیہ میں ایسے مزعومہ اجماعات کی پول کھل جاتی ہے-لہٰذا اجماع کا دعویٰ کرنے میں کمال احتیاط سے کام لینا چاہیے)

مولانا وحیدالدین خاں:-میرے نزدیک فقہاء میں کوئی نہ امام اعظم ہے اور نہ کوئی امام اصغر،سارے فقہا برابر ہیں-میرے نزدیک انہی چاروں کی تقلید پر اتفاق کر لینا درست نہیں- کیوں کہ چاروں فقہا نے اپنے زمانے کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دی- نئے دور میں نئے فقہا مطلوب ہیں، جو دوبارہ حالات کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دیں-

مولانا عبدالحمید نعمانی:-ابھی میں نے کہا کہ قرآن میں جو باتیں صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی ہیں ان میں اجتہاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی کئی ایک مجتہد پیدا ہوئے اور انہوں نے اجتہاد کیا-لیکن جن حضرات کی اجتہادی کاوشیں مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ یہی چاروں ائمہ ہیں-امام ابوحنیفہ،امام مالک،امام شافعی اور امام احمد بن حنبل-اس لیے امت کی مجبوری ہے کہ وہ انہی میں سے کسی ایک کی تقلید کرے، کسی اور امام کے اجتہادات مدون ہی نہیں ہیں تو ان کی تقلید کیوں کر ممکن ہے؟ اس کے

ساتھ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن کے جو احکامات ہیں، جو احادیث ہیں، جو صحابہ کے معمولات ہیں، وہ سب کے سب انہی چاروں میں موجود ہیں،کوئی حکم یا عمل ان سے الگ نہیں مل سکتا، اس لیے وہ حضرات بھی جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے آج تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی اجتہاد کرتے ہیں، ان کا وہ اجتہاد ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں ضرور موجود ہوتا ہے تو شرعی مسائل میں اختلافات توسع کے لیے ہیں اور یہ توسع ائمہ اربعہ کی تقلید سے حاصل ہوجاتا ہے،اب ہمیں کسی بھی قول یا عمل پر عمل کرنے کے لیے الگ جانے کی ضرورت نہیں، ائمہ اربعہ کے یہاں سب کچھ موجود ہے- زور سے آمین کہنے کا مسئلہ ہو، یا قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہو،ان مسائل میں آج کچھ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں، حالاں کہ وہ جو تحقیق بھی لے کر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی امام کے یہاں موجود ہے،ان کا اجتہاد کوئی الگ سے نہیں ہوتا-

اب کچھ لوگ آج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ انہی چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید کرو؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے ہمیں ان میں سے کسی ایک کی تقلید کا حکم نہیں دیا-لیکن بعد میں جو حالات سامنے آئے یہ حالات وجوب پر دلالت کرتے ہیں-یعنی صورت حال ایسی ہی ہے کہ انہیں میں سے کسی ایک کا اتباع کرنا آپ کی مجبوری ہے-آپ نہ تو بیک وقت ان چاروں کی پیروی کر سکتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ان سے ہٹ کر کسی اور کی تقلید کر سکتے ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان سے ہٹ کر کوئی اجتہاد سامنے آ ہی نہیں سکتا-اسی لیے علما نے کہا ہے کہ "حالات" کے پیش نظر ان چاروں میں سے کسی ایک کی پیروی واجب ہے اور اس سے انکار سخت گمراہی ہے، رہا یہ کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب فتح القدیر وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے، یہ ان کے تفردات ہیں اور تفردات بھی ایسے کہ وہ کسی نہ کسی امام متبوع کے یہاں ضرور موجود ہیں، اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی، اس لیے امت کا جو عمل ہے وہ غلط نہیں ہوسکتا-اسی لیے امام ترمذی وغیرہ نے کہا کہ عمل امت سے ضعیف حدیث صحیح کی منزل میں آجاتی ہے اور اسی وجہ سے صحیح

حدیث کے مقابل اگر ضعیف حدیث معمول بہ ہے تو وہ زیادہ لائق اتباع ہے، سنت کہتے ہی اسی کو ہیں جو معمول ہو، مثال کے طور پر بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے اور اپنی زوجہ کو بوسہ لیتے تھے، یا جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے، تو یہ چیزیں اگرچہ حدیث صحیح سے ثابت ہیں لیکن چوں کہ ان پر عمل نہیں رہا، اس لیے یہ سنت نہیں ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی حالت میں ان کے نواسے ان پر چڑھ جاتے تھے، یہ حدیث موجود ہے، لیکن یہ امت میں معمول اور جاری نہیں ہوا، اس لیے اس حدیث کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی نواسہ تلاش کرنے جائے اور نماز کی حالت میں اپنے اوپر سوار کر لے- تو خلاصہ یہ کہ حدیث صحیح کا موجود ہونا ہی کافی نہیں ہے، ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس کے تعلق سے صحابہ کا عمل کیسا رہا، تابعین کا عمل کیسا رہا، تبع تابعین کا عمل کیسا رہا وغیرہ-

سوال (۴):- کیا حضرات محدثین ومفسرین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- محدثین ومفسرین سے مراد صحاح ستہ وغیرہ کے مصنفین اور مشہور کتب تفسیر کے مرتبین ہیں تو بلا شبہ وہ مقلد تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استخراج احکام کے لیے صرف حفظ حدیث کافی نہیں اور بھی بہت سے لوازم ہیں، جن کے بغیر کار اجتہاد کی تکمیل نہیں ہو سکتی- ان لوازم کا فقدان ان خداترس حضرات کے لیے اجتہاد سے مانع اور تقلید کا باعث ہوا-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- بعض محدثین ومفسرین اصولی طور پر ائمہ اربعہ کی طرف انتساب کرتے تھے، لیکن فروعات میں ان کے پابند نہ تھے، جیسا کہ آج کل کے اکثر منتسبین مذاہب علماء کا وطیرہ ہے- یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعض اجلہ تلامذہ نے ایک تہائی سے دو تہائی تک مسائل فرعیہ کے اندر اپنے اساتذہ کا ساتھ نہیں دیا- لہٰذا اگر مقصودِ اصلی اتباع دلیل ہو تو میرے خیال میں انتساب اگر مستحسن امر نہیں تو حرام ومکروہ بھی نہیں ہے، بلکہ جواز اور مباح کے دائرہ میں آتا ہے-

مولانا وحید الدین خاں:- مفسرین کا لفظ میرے نزدیک اس بحث میں مبہم ہے- کیوں کہ مفسرین چودہ سو سال تک پھیلے ہوئے ہیں- البتہ طبقہ اول کے محدثین کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، میرے مطالعے کے مطابق محدثین کا کوئی فقہی مسلک نہ تھا- اس

معاملے میں میری رائے وہی ہے جو ابن رجب حنبلی کی رائے ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- وہ اسی لیے کہ اجتہاد خصوصی ذہن اور عمل کا نام ہے اور یہ سب کے بس کی چیز نہیں ہے، چاہے وہ محدث ہو، مفسر ہو یا اور کوئی- میں نے کہا کہ امت میں ہمیشہ دو ہی طبقے رہے ہیں، ایک وہ جو بات مانتا ہے اور دوسرا وہ جس کی بات مانی جاتی ہے، جس کی بات مانی جائے گی وہ مجتہد ہوگا اور جو بات مان رہا ہے وہ مقلد ہے- سمجھ بوجھ اس کے اندر بھی موجود ہے لیکن اس درجے کی نہیں کہ وہ خود اجتہاد کر سکے- اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ کتب احادیث پڑھنے کے دوران یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ لوگ کس کے مقلد تھے، امام مسلم کس کی تقلید کرتے تھے، فقہی امور میں امام نسائی کس کا اتباع کرتے تھے- اہل علم میں اس تعلق سے اختلاف بھی ہوتا ہے- کچھ حضرات انہیں شافعی بتاتے ہیں، کچھ حنفی بتاتے ہیں، کچھ حنبلی بتاتے ہیں تو یہ بحث کیوں ہے؟ اسی لیے کہ یہ حضرات محدث ہونے کی حیثیت سے معروف ہیں- انہوں نے احادیث کی تلاش وجستجو کی، تحقیق کی، دوسروں سے حدیثیں سنیں اور خود انہیں بیان کیا، ان کا مشغلہ یہی تھا، انہوں نے احادیث سے مسائل کے استنباط واستخراج کا عمل نہیں کیا- اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض محدثین نے اجتہاد بھی کیا، لیکن ان کا اجتہاد باضابطہ نہیں ہے اور نہ وہ مدون ہے- مثلاً میں اگر سوال کروں کہ تراویح کے بارے میں امام بخاری کا کیا مسلک ہے؟ وہ بیس پڑھتے تھے یا آٹھ پڑھتے تھے یا بارہ پڑھتے تھے؟ تین طلاق کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا؟ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کی زیارت کو جانا کیسا ہے؟ اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں، جن کے تعلق سے اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک دریافت کیا جائے تو اس کا جواب نہیں مل سکتا-

آپ کا سوال محدثین اور مفسرین کے طبقے سے ہے اور ان کے حوالے سے ہاں اور نہیں میں جواب نہیں دیا جا سکتا- اس لیے کہ محدث ہونا، مفسر ہونا ایک خاص وصف ہے، ہو سکتا ہے کہ محدث یا مفسر ہونے کے ساتھ کوئی مجتہد بھی ہو، یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مجتہد نہ ہو مقلد ہو، تو مجتہد یا مقلد ہونے کا سوال اگر کسی فرد کے تعلق سے کیا جائے تب تو صحیح ہے لیکن طبقات کے تعلق سے اگر کیا جائے تو ہاں یا نا میں اس کا جواب نہیں مل سکتا- بہت سے

محدثین اور مفسرین مقلد تھے اور بعض مجتہد تھے، لیکن ائمہ اربعہ جو محدث و مفسر بھی تھے، کے علاوہ کسی اور کی فقہ باضابطہ مدون نہ ہوسکی-

سوال (۵):-اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کردیے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان عبقری علمائے مقلدین کی علمی خدمات کو کیا نام دیں گے جن پر آج بجا طور پر امت کو فخر کرنے کا حق ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-اولاً ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کردیے- تحقیق کا عمل برابر جاری ہے اور جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا فقہائے مقلدین کی حیرت انگیز علمی و تحقیقی خدمات اس پر شاہد عدل ہیں اور اگر یہ کہیں کہ تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کردیا تو یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں- جو شخص اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی لیے ائمہ کرام نے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اپنے تلامذہ سے یہ فرمایا کہ ''ہم نے جس مأخذ سے احکام اخذ کیے ہیں، اسی سے تم بھی اخذ کرو''

یا یہ فرمایا کہ ''ہمارے بیان کردہ احکام پر تمہارے لیے عمل جائز نہیں، جب تک یہ نہ جان لو کہ ہم نے یہ احکام کہاں سے اخذ کیے''- ظاہر ہے کہ اس طرح کے ارشادات کے مخاطب کوفہ و بغداد اور مدینہ و مصر کے وہ دوکاندار اور کاشت کار یا صنعت کار نہیں جو کتاب و سنت اور اخبار و آثار کی تصریحات، اشارات، دلالات اور اقتضاءات سے نابلد اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ فوجی اور ملازمت پیشہ بھی نہیں جو تلاوت و قرأت سے زیادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اہل اجتہاد کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور نا اہل کے لیے شروع ہی سے بند ہے-

ثانیاً اگر کوئی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اہلیت اجتہاد ہو یا نہ ہو اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے چوپٹ کھلا رہنا چاہیے تو بہت صفائی کے ساتھ عرض ہے کہ جو دروازہ صرف اہل حضرات کے داخلے کے لیے کھلا اگر اس سے صرف نا اہلوں کی آمد و رفت ہونے لگے تو اسے سختی کے ساتھ بند کردینا ہی عقل و دانش اور ایمان و حکمت ہر ایک کا تقاضا ہے، اسی میں متاع گراں مایہ کی حفاظت ہے اور خلاف ورزی میں کھلی ہوئی بربادی-

تجربہ شاہد ہے کہ آج اہلیت اجتہاد تو درکنار ارشادات ائمہ کے مصادر و مأخذ سے

کامل آشنائی بھی مفقود ہے، اہلیت کے بغیر منصب اجتہاد پر تمکن کا شوق اور اس کی جسارت ناروا ایسے ہی دلوں میں ہوتی ہے جو خوف الٰہی سے عاری ہوں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-یقیناً تقلید جامد نے علم و تحقیق کے دروازے بند کردیے، کیونکہ جب آدمی کسی ایک امام کے تمام اقوال کو ہی دین سمجھنے لگتا ہے اور اسی کی پیروی کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہے اور دیگر ائمہ کے اقوال اور ادلہ پر نظر نہیں کرتا یا ان کے درمیان جمع و تطبیق اور ترجیح کی صورتوں کو بروئے کار نہیں لاتا تو بلا شبہ علم و تحقیق اور اجتہاد و ترجیح کی راہ بند ہوجاتی ہے اور اگر حضرات مقلدین تقلید کے بجائے تحقیق و اتباع کی راہ اختیار کرتے تو اصحاب مذاہب ائمہ کرام کی خدمات علمیہ و فقہیہ کو مزید فروغ حاصل ہوتا اور ان سے استفادہ بھی عام ہوتا اور جو لوگ مذہب اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کے تقلیدی فقہی مذاہب اور ان کے فکری و علمی جمود اور آپسی اختلاف و انتشار کے باعث تردد کا شکار ہوکر دولتِ اسلام سے محروم نہ ہوتے- لہٰذا علمائے امت کی خدمات جلیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے ہمیں ادلہ صحیحہ اور نصوص شرعیہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ''**اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء**'' (الاعراف:۳) تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو- اور ''**اتخذوا أحبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ**'' (التوبہ:۳۱) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے کی تفسیر مأثور جو عدی بن حاتم سے بسند صحیح مسند احمد و سنن ترمذی میں منقول ہے، اگر سامنے رکھی جائے تو تقلید جامد کی قباحت و شناعت کھل کر سامنے آجائے گی اور امت تقلید پر فخر کرنے کے بجائے شرم و ندامت کے آنسو بہائے گی-

مولانا وحیدالدین خاں:-میرے نزدیک یہ الزام نہیں بلکہ ایک درست بات ہے- تقلید ہمیشہ تخلیقی فکر کا دروازہ بند کرتی ہے اور مسلمانوں میں ایسے ہی ہوا- یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال کی مسلم تاریخ میں صرف ایک تخلیقی مفکر پیدا ہوا- اور وہ تھے علامہ ابن خلدون-

مولانا عبدالحمید نعمانی:-یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کردیے ہیں وہ مسائل کا صحیح شعور نہیں رکھتے- ان کو پتا ہی نہیں کہ تقلید کیا چیز ہے، مجتہد امام کی

رہنمائی میں صحیح جگہ پہنچنا تقلید کہلاتا ہے-تقلید کا مطلب نہ تو آوارگی ہے اور نہ ایسی غلامی ہے کہ آدمی سو فیصد اندھا ہو جائے- بلکہ امام سے حسن ظن رکھتے ہوئے شریعت کا جو منشا ہے، جو مطلوب ہے اسی کی پیروی کرنے کا نام تقلید ہے-تقلید اور اتباع میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور اتباع کرنا اپنے سے بڑے کا یہ فطرت ہے-اس لیے یہ کہنا کہ تقلید نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے یا غلام بنا دیا ہے،تقلید کے مفہوم سے ناواقفی کا نتیجہ ہے، اگر تقلید کا مطلب آنکھ بند کر کے دوسروں کی پیروی لے لیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ مقلدین نے اتنے سارے علمی وتحقیقی کام کیوں کیے؟ آپ نظر اٹھا کر دیکھ لیجیے کل سے آج تک سارے بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارنامے انہوں نے انجام دیے جو خود مقلد تھے- ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا-حدیث کی خدمت ہو، فقہ کی ہو، قرآن کی ہو، سب انہی لوگوں نے کی ہے، حدیث، تفسیر، فقہ کسی بھی فن میں علماء کے طبقات آپ دیکھ لیجیے، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات مالکیہ، طبقات حنابلہ تو ملیں گے، لیکن کہیں بھی آپ کو طبقات غیر مقلدین نام کی کتاب نہیں مل سکتی تو اہل علم ومجتہدین کے طبقات یہی چاروں ہیں، کوئی پانچواں طبقہ موجود نہیں ہے-آج جو لوگ ان چاروں سے ہٹ کر راہ نکالنے کی کوشش میں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی روش بھی کمتر لوگوں کی متشددانہ تقلید ہی ہے- میں دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ ائمہ اربعہ کی تقلید کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں وہ کہیں، اس سے زیادہ شدت سے امام ابن تیمیہ کی تقلید کرتے ہیں اور ابن قیم کی تقلید کرتے ہیں تو جو لوگ آج مقلد کہلانے کی بجائے اپنے کو اہل حدیث کہہ رہے ہیں وہ بھی اپنے بڑوں کی تقلید ہی کر رہے ہیں-

سوال (٦):-امام اعظم ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شرعی احکام کی تخریج و استنباط کے لیے اصول وضع کیے، دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کسی نہ کسی طور سے ان کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین حضرات سب سے زیادہ انہیں کے خلاف صف آرا رہتے ہیں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-امام اعظم سے عداوت کوئی نئی چیز نہیں خود ان کے زمانے کا واقعہ ہے، جسے خطیب نے بھی بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے بیروت میں حضرت عبداللہ بن مبارک شاگرد امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا یہ کوفہ میں ابوحنیفہ کنیت

رکھنے والا کون مبتدع پیدا ہوا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں، میں اپنے گھر واپس آیا فاقبلت علی کتب ابی حنیفه امام ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھنی شروع کیں (اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں) ان سے کچھ مسائل منتخب کر کے لکھے اور سرخی یہ ڈالی: قال النعمان بن ثابت، پھر امام اوزاعی کے پاس گیا، مجھ سے وہ اوراق انہوں نے لے لیے اور مطالعہ کے بعد پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ ہیں، جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی، فرمایا: هذا نبيل من المشائخ، ابن مبارک نے بتایا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا- بعد میں امام اوزاعی کی ملاقات امام ابوحنیفہ سے مکہ میں ہوئی اور عبداللہ بن مبارک کے پیش کردہ مسائل اور دیگر مسائل پر گفتگو کے بعد انہوں نے امام اعظم کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قول سے استغفار کیا اور عبداللہ بن مبارک سے فرمایا: ابوحنیفہ کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا، میں نے انہیں اس کے برخلاف پایا، تم ان کی بارگاہ فیض سے وابستہ رہو- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عصر ہی میں وہ حاسدین کی عداوتوں اور غلط پروپیگنڈوں کا نشانہ تھے-

مگر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے استنباط کے اصول وقواعد وضع کیے اور فقہی احکام کی تدوین کی- دیگر ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا، امام ابن حجر ہیتمی شافعی نے الخیرات الحسان میں یزید بن ہارون کی روایت لکھی ہے کہ امام سفیان ثوری نے کسی حیلے سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس سے استفادہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم کی ایک تصنیف کتاب الرہن بھی تھی-

بالفرض امام اعظم نے خود کوئی کتاب نہ لکھی، یا لکھی اور ناپید ہوگئی، ان کا مذہب ان کے تلامذہ نے قلم بند کیا یا ثقات نے زبانی طور پر اس کی روایت کی تو اس سے امام اعظم کی فقہی خدمات اور علمی جلالت پر حرف نہیں آتا- اجلۂ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبد اللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کوئی کتاب نہ آج دستیاب ہے نہ پہلے کسی زمانے میں تھی، لیکن تفسیر وحدیث اور فقہ میں ان حضرات کی عظمت شان سے کسی

باخبر منصف مزاج کو انکار نہیں- آخر امام شافعی نے سارے لوگوں کو امام ابوحنیفہ کی عیال کیوں بتایا؟ خود اپنی یا اپنے استاذ امام محمد یا امام مالک رحمہم اللہ کی عیال نہیں بتایا؟ کیا امام شافعی بھی امام ابوحنیفہ کی تقلید جامد یا اندھی عقیدت میں مبتلا تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اہل انصاف جس امر کو امام اعظم کی اولیت اور عظمت شان کی دلیل سمجھتے ہیں، وہی اہل عناد کی عداوت ومخالفت کی بنیاد ہے، امام اعظم نے آزادانہ اجتہاد سے کام نہ لیا- بلکہ پہلے اجتہاد کے اصول وضوابط مقرر کیے، دلائل کے مراتب اور ان کی حیثیتوں کا تعین کیا، پھر دلائل اور قواعد کی روشنی میں فروع واحکام کی تخریج فرمائی، دیگر ائمہ عادلین رحمہم اللہ نے بھی اس عادلانہ روش کی پیروی کی- مگر آج جب کسی کے سر میں آزادانہ اجتہاد یا ہوائے نفس کے مطابق انتخاب احکام کا سودا سماتا ہے تو یہ اصول وضوابط اس کی آزادی طبع اور غلط روی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں- اس لیے دل کا بخار اسی پر اترتا ہے ،جس نے اس طریقے کی بنا ڈالی-

امام اعظم کے خلاف علم حدیث میں کم مائیگی کا پروپیگنڈا بھی کوئی نیا نہیں، مگر امام ابو یوسف جو امام اعظم کے شاگرد اور ان کی مجلس فقہ کے رکن تھے، علم حدیث میں ان کے تبحر اور مہارت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ نے کیا ہے، جس کے باعث اعدائے زمانہ کے لیے بھی مجال انکار نہیں، یہ امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات امام ابوحنیفہ سے میرا اختلاف ہوتا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا، پھر میں محدثین کوفہ کے یہاں جاتا کہ میرے یا میرے شیخ کے قول کی تائید میں کوئی حدیث مل جائے ،جس کے ذریعہ اختلاف کا تصفیہ ہو-

مجھے امام کے قول کی تائید میں ایک دو حدیثیں مل جاتیں، میں آکر امام کو سناتا وہ قبول نہ کرتے، میں عرض کرتا یہ تو آپ کے قول کے موافق ہے، اسے آپ کیوں نہیں لیتے؟ وہ فرماتے اس میں فلاں فلاں علت قادحہ ہے- اہل کوفہ کا علم حدیث مجھ سے مخفی نہیں، غور کیجیے جس شیخ کی نظر اتنے جلیل القدر ائمہ حدیث سے فزوں تر ہو، خود اس کی حدیث دانی کا پایہ کتنا بلند ہوگا؟ مگر تعصب وعناد کی بیماری کا کوئی علاج نہیں-

محدث کا کام سونا جمع کرنا ہے اور ناقد کا کام پرکھ کر بتانا کہ کون سونا کتنا کھرا ہے کتنا

کھوٹا؟ اسی طرح محدث کا کام شفا بخش دواؤں کا ذخیرہ کرنا ہے اور فقیہ کا کام امراض اور مریضوں کی تشخیص کے ساتھ ان دواؤں کا استعمال کرانا ہے، امام اعظم کے استاذ امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کیے گئے وہ نہ بتا سکے- امام ابوحنیفہ سے پوچھا انہوں نے بتا دیا- استاذ نے پوچھا تم نے یہ جوابات کہاں سے اخذ کیے؟ عرض کیا فلاں فلاں حدیثوں سے، جو آپ نے اس اس سند سے مجھ سے بیان فرمائیں- فرمایا اے فقہا تم لوگ طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں اور ابوحنیفہ تم تو دونوں ہو- میں نے سو دن میں جو حدیثیں تم سے بیان کیں وہ ایک ساعت میں تم مجھے سنائے دے رہے ہو-

دونوں واقعے الخیرات الحسان لابن حجر الہیتمی الشافعی میں ہیں-

پھر فقہ واجتہاد کا کمال علم حدیث میں رسوخ کے بغیر متصور بھی نہیں، حدیث کے تمام مراحل اور شعبوں کو عبور کیے بغیر پایۂ اجتہاد تک رسائی ناممکن ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب کسی کتاب کی نسبت خواہ وہ اصول میں لکھی گئی ہو یا فروع میں صحیح نہیں ہے- فقہ حنفی کا سارا ذخیرہ امام محمد بن حسن شیبانی کی علمی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے، جب کہ قاضی ابو یوسف کا منصب قضا اس کی نشر و اشاعت کا مؤثر ذریعہ ہے- جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور تالیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسباب اختلاف الفقہاء فی الفروع کے تحت اس موضوع کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اصول فقہ کے باب میں امام شافعی کی تالیف شہیر ''الرسالۃ'' کو اول تالیف گردانا ہے اور یہی درست ہے- بہر حال امام ابوحنیفہ ایک بزرگ عالم وفقیہ ہیں- یہ الگ بات ہے کہ علم حدیث میں عدم رسوخ کے سبب ان کی فقہ مسائل شرعیہ میں دیگر ائمہ کرام کی فقہ کے مقابلے میں صحت وصواب سے بعید ہے- بایں ہمہ ذاتی طور پر ان سے بغض وعناد رکھنا یا ان کے خلاف صف آرا ہونا کسی حال میں درست نہیں ہے- البتہ مسائل کی تحقیق وتنقیح میں مخالف ادلہ شرعیہ صحیحہ اقوال پر رد کرنا علماء کا دینی فریضہ ہے اور حق کی توضیح وتبیین میں کسی قسم کی مداہنت جائز نہیں ہے بشرطیکہ ادب واحترام ملحوظ خاطر ہو-

مولانا وحیدالدین خاں:- میرے نزدیک امام ابوحنیفہ نے جو اصول وضع کیے وہ کلی

معنی میں درست نہ تھے- ان کی اصول سازی میں ایک ایسی چیز شامل ہوگئی جو روح شریعت کے مطابق نہ تھی اور وہ ہے فنّیت - مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کا یہ اصول کہ **الحق لایتعدد** سب سے بڑی وجہ ہے کہ مسالک فقہی کا اختلاف شدید بن گیا- حالاں کہ یہ شدت ایک ایسا غلو تھا جو اسلام میں ممنوع ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- یہ تنگ نظری اور ایک طرح کی معاندت کا معاملہ ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو منہج تحقیق ہے اور استنباط کے جو اصول وضابطے ہیں، ان میں بہت گہرائی ہے، بہت بلندی ہے، جیسا کہ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الشریعۃ الکبری میں یہ بات لکھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پاتے تو مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں- حضرت امام اعظم سے خصوصی معاندت کی کچھ خاص وجوہات ہیں- ایک یہ کہ وہ ائمہ میں اقدم ہیں- بہت سی روایتوں کے مطابق انہوں نے کئی ایک صحابہ کو دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے- دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فقہ عملی شکل میں مدون ہوگئی- حکمرانوں نے باب قضاء میں اس کو نافذ کیا- ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مقلدین میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ۹۵ رفی صد مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں تو اب مخالفین تقلید نے یہ دیکھا کہ ہم جہاں جاتے ہیں، دنیا کے جس خطے میں پہنچتے ہیں وہاں حنفی پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا مقابلہ بھی زیادہ تر احناف سے ہی ہوتا ہے اور جواب دینے والے بھی یہی ہوتے ہیں، ان کی کاٹ کرنے والے بھی زیادہ احناف ہی ہوتے ہیں، اس لیے فطری طور پر ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی سے ہوتی ہے-

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو لگتا ہے کہ کتاب وسنت کا نعرہ تو ہم لگاتے ہیں، مگر جب عوام کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو وہ حنفی مفتیوں سے رجوع کرتے ہیں کہ دنیا میں زیادہ وہی ہیں- خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ان کی مخالفتیں ہوئیں وہ اسی لیے ہوئیں کہ لوگ دیکھتے تھے کہ حدیث کی خدمت تو ہم کر رہے ہیں، لیکن عوام کا رجوع امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے- حالاں کہ یہ واضح سی بات ہے کہ کوئی مریض دواخانہ نہیں جاتا، جہاں ہزار

وں طرح کی دوائیں ہوتی ہیں، ہر کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے- تو محدثین کی مثال دوا خانے والے کی ہے، جن کے پاس دوائیں تو بہت سی ہیں، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی- یہ کام مجتہد کرے گا، جس کی دواؤں کی ساخت پر، ان کے اثرات پر اور مریض کی حالت پر گہری نظر ہے- تو عوام کا فقہ حنفی کی طرف رجوع کرنا بھی امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ ہے اور اس کا سلسلہ بہت دراز ہے- چوں کہ فقہ حنفی کی عمر سب سے لمبی ہے، اس لیے اس کی مخالفت کا تسلسل بھی سب سے زیادہ دراز ہے-

سوال (۷):- تقلید شخصی کا مفہوم کیا ہے اور امت کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا مگر مجتہدین کے اقوال تک اس کی رسائی ہے اور بے شمار متفقہ مسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مجتہدین کے نتائج فکر مختلف ہیں، ایسی حالت میں وہ کسی ایک ہی مجتہد کی پیروی کر سکتا ہے، اسی کا نام تقلید شخصی ہے، اس کے لیے بھی اس مجتہد کے اصول وفروع کو جاننا، سیکھنا، پوچھنا، سمجھنا ضروری ہے، اگر وہ بیک وقت دو مجتہد کے قول مثلاً جواز وعدم جواز دونوں پر عمل کرنا چاہے تو یہ جمع نقیضین کی آرزو ہوگی جس کا وقوع محال ہے اور اگر یہ چاہے کہ جس وقت جو آسان معلوم ہوا سے اپنا لیا کرے تو یہ شریعت کی نہیں ہوائے نفس کی پیروی ہوگی اور اگر اسے یہ تکلیف دی جائے کہ تمام مذاہب کی تحقیق کرو، ہر قول کو کتاب وسنت اور قیاس و اجتہاد کی روشنی میں پرکھو جو زیادہ درست اور مطابق دلائل نظر آئے اسے لے لو، دوسرے کو چھوڑ دو تو یہ ایک عامی کی قوت وصلاحیت سے باہر ہے، جس کا وہ مکلّف نہیں، وہ ساری عمر کھپا کر بھی اتنی اہلیت پیدا کرنے سے عاجز ہے پھر عمل کب کرے گا؟ قبر میں جانے کے بعد یا میدان قیامت میں؟ اور اگر کوئی عالم بے قید تیار ہو جائے کہ تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمام ائمہ کے اقوال ودلائل کی تحقیق تام فرمانے کے بعد ایک بے نظیر معجون مذاہب تیار کیا ہے، تم اسے لے لو اور حسب ضرورت استعمال کرتے رہو، اس میں ساری مشکلات سے نجات ہے اور یہ ساری آسائشوں کا انتخاب لاجواب ہے- اب وہ شخص وہ نسخۂ کیمیا ہاتھ میں لے اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتا رہے تو یہ بارہ سو سال پہلے کے کسی امام کو

چھوڑ کر پندرہویں صدی کے ایک عالم بے قید کی تقلید شخصی ہوگی اور آج اسی پر پوری دنیا کے غیر مقلدین سختی سے کاربند ہیں۔

مگر بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے ہی پوری دنیائے اسلام ایک امام مجتہد کی پابندی پر کاربند ہے، پھر فرق کیا رہا؟ صرف یہ کہ قدیم امام جو علم و تقویٰ، فقاہت واجتہاد، عہد رسالت سے قرب وغیرہ ہر لحاظ سے اعلیٰ واعظم تھا اسے چھوڑ کر آج کے ہر لحاظ سے اشنی وپست شخص کی پیروی ہو۔

ایک امام معین کی پیروی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام سے ہمیں باخبر کرتا ہے اور جہاں جہاں اس نے خود اجتہاد کیا ہے تو اپنی طرف سے اس نے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ٹھہرائی ہے، بلکہ نصوص کتب وسنت میں نظر غائر کے نتیجے میں جس چیز کو اس نے خدا اور رسول کے یہاں حلال جانا ہے، اسے حلال بتایا ہے، جسے حرام جانا ہے، اسے حرام بتایا ہے اور ہم نے اس کی دیانت وتقویٰ کا مشاہدہ اور اس کے رسوخ علم کا تجربہ بالواسطہ یا بلا واسطہ کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اقوال کو قبول کیا ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: ۔تقلید شخصی، یعنی غیر نبی ﷺ کا مطلق التزام اور تمام امور میں کسی ایک عالم وفقیہ کی مکمل اقتداء ایک حرام، منکر اور اجماع کے خلاف امر ہے۔ بعض حالات میں اور کچھ ضروری قیود وحدود کے ساتھ بعض علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے جس کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کرنا چاہیے۔ یقیناً امت مسلمہ کی بھلائی اُسی راستہ کی پیروی میں ہے جس کی پیروی سلف صالحین صحابہ وتابعین نے کی۔ چنانچہ امام احمد کا مشہور قول ہے ''**لاتقلدونی ولا تقلدوا مالکاً ولاالشافعی ولا الاوزاعی ولا الثوری وخذوا الاحکام من حیث اخذوا**'' نہ میری تقلید کرو اور نہ مالک، نہ شافعی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی تقلید کرو بلکہ احکام وہاں سے لو جہاں سے یہ حضرات اخذ کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اپنے شاگرد خاص امام ابو یوسف کو نصیحت فرماتے ہیں ''**اننا بشر نقول القول الیوم ونرجع عنه غداً**'' یعنی مجھ سے سنی ہوئی ہر بات مت لکھ لیا کرو، کیونکہ ہم بشر ہیں، آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے پلٹ جاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے ''**اذا صح**

الحدیث فهو مذهبی'' یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو اور امام مالک کا فرمان ''**لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها**'' یعنی امت کا آخری دور اس وقت اصلاح ودرستگی کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اوائل امت کی راہ اختیار نہ کرے۔ (یعنی منہج صحابہ پر کتاب وسنت کی کامل پیروی کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں) (**ایقاظ الهمم للفلانی واعلام الموقعین لابن القیم والمیزان للشعرانی وغیره**)

تقلید شخصی کے وجوب کے قائلین کے پاس مغالطات کے سوا کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور کتاب اللہ وسنن صحیحہ کی پیروی کا جذبہ خالص ہی انسان کو اباحیت اور فکری وعملی انارکی سے نجات دے سکتے ہیں۔ ورنہ بعض فقہاء (سامحہم اللہ، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے) کی حلت وحرمت کے باب میں حیلہ سازیاں اہل علم وتحقیق سے مخفی نہیں۔ لہٰذا امت کو نہ صرف یہ کہ تقلید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اتحاد امت کے لیے یہ زہر ہلاہل ہے۔ تقلید شخصی کے رواج سے پہلے کی ابتدائی چار صدیوں میں امت مسلمہ کے متعلق مقلدین کیا رائے قائم کریں گے جو کسی ایک متعین شخص کی تقلید پر متفق نہ تھی؟ جب کہ قرون مفضلہ، بہترین ادوار میں اسلام نے نمایاں ترقی کی ہے اور یہ ترقی صرف اتباع کتاب وسنت کا ثمرہ تھی۔

مولانا وحیدالدین خاں: ۔میرے نزدیک تقلید شخصی اصولاً ایک نادرست چیز ہے۔ وہ صرف ضرورت شرعی کی بنا پر درست قرار پا سکتی ہے اور وہ یہ کہ جو آدمی براہ راست عربی مأخذ سے مسئلہ دریافت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، وہ کسی ایسے شخص کا مقلد بن جائے، جس کے علم اور نیت پر اس کو اعتماد ہو۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: ۔ ابھی جیسا کہ میں نے بتایا کہ منصوص مسائل میں تقلید کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے ہی جو مسائل اجماعی ہیں، متفق علیہ ہیں، ان میں بھی تقلید کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ ہاں! جو غیر منصوص مسائل ہیں اور ان میں مجتہدین کے مابین اختلاف ہو گیا ہے، اب ان مسائل میں ہم سب کی باتیں کیسے مان سکتے ہیں؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ تو اب یہیں پر تقلید کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ کوئی عمل جب بھی کرے گا تو ایک ہی پر کرے گا۔

تقلید شخصی دراصل اتباع ہوا سے روکنے کے لیے ہے، تقلید شخصی نہیں ہوگی تو جس کو جو مسئلہ

جہاں آسان نظر آئے گا اس کا اتباع کرے گا تو گویا یہ شریعت کی نہیں اپنی طبیعت کی پیروی ہوگی-

اب مثال کے طور پر ایک شخص نے وضو کیا اور مس ذکر کر لیا تو ایک امام کے نزدیک تو اس کا وضو ٹوٹا، دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- پھر وضو کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آیا تو ایک کے نزدیک تو وضو ٹوٹ گیا، دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- تو ایک ہی وقت میں اس نے مس ذکر بھی کر لیا اور اس کے بدن سے خون بھی نکل آیا تو اس کا وضو تو دونوں اماموں کے نزدیک ٹوٹ گیا- اب گویا اس نے بغیر وضو کے ہی نماز پڑھی- اب وہ کہے کہ مس ذکر کے مسئلہ میں ہم نے امام ابوحنیفہ کی پیروی کی اور خون کے مسئلہ میں امام شافعی کی پیروی کی- اس طرح میری نماز درست ہوگئی، کیوں کہ دونوں امام برحق ہیں- تو اس کا یہ فریب دراصل اماموں کی تقلید نہیں، ہوائے نفس کی تقلید ہے- اسی لیے تقلید شخصی ضروری ہے- ایک ساتھ دو چار ائمہ کی تقلید نہیں کی جا سکتی- اسی لیے منطق کا مسئلہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف فکر کا انتقال بھی محال ہے اور عمل بھی بہ یک وقت محال ہے-

علاوہ ازیں تقلید مطلق تو سب کے نزدیک جائز ہے، قرآن کا حکم ہے کہ **فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون** - اس کو سب مانتے ہیں اور یہ اصول ہے کہ جو چیز کلیات میں جائز ہوگی وہ جزئیات میں بھی جائز ہوگی تو جب تقلید مطلق جائز تو عقلی طور پر تقلید شخصی جو تقلید مطلق کی ہی فرع ہے ضرور جائز ہونی چاہیے-

اس کے ساتھ ایسا بھی نہیں کہ حالات وضروریات سے آنکھیں موند کر تقلید کی جاتی ہو- تقلید شخصی کے اندر بھی اس بات کی وسعت ہے کہ اگر ضرورت ہو، مجبوری ہو تو ہم توسع کے لیے دوسرے امام کے قول پر عمل کر سکتے ہیں- جیسے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں اب ہمارے یہاں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے- تقلید شخصی کا معنی ہرگز تقلید جامد نہیں ہے-

سوال (۸):- تقلید کی مخالفت کے پیچھے کیا واقعی ''دعوۃ الی الکتاب والسنۃ'' کا جذبہ کارفرما ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- غیر مقلدین نے پہلے تو بہت شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کتاب وسنت کی پیروی کرو، ائمہ کی پیروی شرک جلی ہے اور تمام مقلدین مشرک مباح

الدم ہیں، وہ ''**اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله**'' کے مصداق ہیں، وہ ائمہ کی تحلیل وتحریم کو مان کر ان کے پجاری ٹھہرے، اس لیے چھ سو سال کی پوری امت شرک خالص پر گزری-

اس دعوے کا تقاضا یہ تھا کہ غیر مقلدین ایسا مجموعۂ احکام منظر عام پر لاتے جو صرف کتاب وسنت کی تصریحات پر مشتمل ہو اور کسی امام کے قیاس واجتہاد اور تحلیل وتحریم سے یکسر خالی ہو، مگر یہ کام غیر مقلدین سے آج تک نہ ہو سکا- جیسے چکڑالوی فرقہ نے صرف کتاب اللہ کے اتباع کا نعرہ بلند کیا، مگر کوئی ایسا نظام عمل پیش کرنے سے عاجز رہے جو صرف قرآن مجید کی تصریحات پر مشتمل اور تمام شعبہائے زندگی پر حاوی ہو-

غیر مقلدین کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جو کتاب وسنت میں ان کے اجتہاد کا ثمرہ ہو- ان کا کارنامہ بس یہ رہا کہ بزعم خویش ''تقلید جامد'' سے ہٹ کر ''تقلید سیال'' پر آ گئے- یعنی کسی ایک امام کا پورا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اپنی راحت بدن اور ہوائے نفس کے مطابق مختلف ائمہ کے مذاہب سے کچھ کچھ مسائل چھانٹ کر ایک معجون مرکب تیار کر لیا- اب وہ خود ہی بتائیں کہ ایک امام کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا ''**واتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله**'' کا مصداق ہوا تو چند اماموں کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا اس کا مصداق کیوں نہیں ہوا؟ وہ تو کسی ایک حبر وراہب نہیں بلکہ بقول آپ کے واقعۃً چند احبار ورہبان کو اربابا من دون اللہ بنانے والا ہے، وہی تو اس کا سچا اور پورا پورا مصداق ہے؛

اگر یہ کہیں کہ ہم نے چند احبار کو اپنی تحقیق اور اتباع کتاب وسنت کے تحت مانا ہے تو ایک امام کا مقلد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم نے اپنے امام کو خدا یا رسول نہیں مانا ہے، بلکہ خدا کا بندہ، رسول کا امتی، ان کے ارشادات کا غواص اور ان کے احکام کا مبلغ اور مظہر ہی مانا ہے اور ہمیں بھی تحقیق سے معلوم ہے کہ انہوں نے نہایت اخلاص وامانت، کمال علم وادراک اور وفور آلات اجتہاد کے ساتھ کتاب وسنت کے سمندر میں غواصی کر کے احکام شریعت کے تابناک گوہر نکالے ہیں اور ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیے ہیں تاکہ خدا ورسول کی اطاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت حقہ کی پیروی ہو سکے-

الحاصل تقلید کی مخالفت کے پیچھے اتباع کتاب وسنت کا جذبہ کارفرما نہیں، بلکہ اتباع نفس کا جذبہ کارفرما ہے- یا ان ہی کے الفاظ میں ''تقلید جامد'' سے ہٹ کر'' تقلید سیال'' کا راحت بخش داعیہ کارفرما ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -تقلید کی ضد اتباع ہے اور تقلید کا لفظ اپنے عرفی معنی میں ایک محدَث لفظ ہے- لہٰذا مقصودِ اصلی بنیادی طور پر اتباع کتاب وسنت ہونا چاہیے اور تقلید جامد کی مخالفت کرنے والوں کا مطمح نظر بھی یہی ہے-

مولانا وحید الدین خاں: -تقلید کی موجودہ مخالفت میرے نزدیک صرف کٹر پن یا گروہی عصبیت کی بنا پر ہے- میں تقلید کا جزوی مخالف ہوں- یعنی عوام کے لیے تو میں تقلید کو درست مانتا ہوں، لیکن خواص اہل علم کے لیے نہیں-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -ممکن ہے بہت سے لوگوں کی نیت صالح ہو، لیکن بیشتر لوگ نیک جذبات کے تحت کتاب وسنت کی دعوت نہیں دیتے- میں سمجھتا ہوں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک اصل مسئلہ ہوتا ہی نہیں ہے- میں یہ قطعی طور پر نہیں مان سکتا کہ ان کے سینوں میں ائمہ، صالحین، اسلاف اور اولیاء اللہ سے زیادہ اتباع شریعت کا جذبہ موجود ہے- جتنے اولیاے کرام اور بزرگان دین ہوئے ہیں سب کا مطالعہ کر جایئے، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک، یا دوسرے اولیاے کرام ہیں، مثلاً خواجہ غریب نواز، حضرت صابر کلیری، شہاب الدین سہروردی یا آج بھی جتنے صالح لوگ ہیں، سب کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں تو کیا آج جو لوگ کتاب وسنت کے نام پر تقلید کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے اندر ان حضرات سے زیادہ جذبہ اتباع شریعت ہے؟ جی نہیں! کتاب وسنت کی دعوت کا آخر معنی ہے کیا؟ کیا ائمہ نے کتاب وسنت سے ہٹ کر کوئی قانون بنایا؟ کتاب وسنت کے منشا تک پہنچنے کے لیے اور پورے طور پر شریعت کا اتباع کرنے کے لیے ہی انہوں نے اجتہاد کیے ہیں- تو اجتہاد کتاب وسنت کی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے- ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ ائمہ اور مجتہدین کا جو فہم ہے، یہ عام لوگوں کے فہم سے بڑھ کر ہے- اس میں نسبتاً یہ احتیاط ہے کہ ہم اپنے سے بالا تر فہم والے کے اوپر اعتماد کر کے قرآن وسنت کا اتباع

کریں- یہ کتاب وسنت کی حقیقی پیروی ہے، مخالفت نہیں- پھر کتاب وسنت کی دعوت دینے والے کوئی نمونہ بھی تو پیش کریں، جس کو ہم کہیں کہ یہ کتاب وسنت کی دعوت ہے اور اس سے ہٹ کر کتاب وسنت کی مخالفت ہے- انہوں نے اب تک کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے-

سوال (۹): -غیر مقلدیت کا وجود کب سے اور کیوں ہوا؟

مولانا محمد احمد مصباحی: -ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی نے اس کی تخم ریزی کی اور میاں جی نذیر حسین دہلوی نے اس کی کاشت تیار کی، یعنی یہ پودا تیرہویں صدی کے ربع دوم میں لگا اور ربع سوم وچہارم میں پیداوار مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -مقلدیت اور غیر مقلدیت جیسا کہ عرض کیا گیا اصطلاح حادث ہے- اصل دین، اتباع کا نام ہے ''**اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم**'' لہٰذا اتباع کی تاریخ اُتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ- **وللہ الحمد**- اگر کوئی ائمہ اربعہ کی تقلید کو حرام اور بعد کے کسی عالم کی تقلید کو واجب گردانتا ہے تو اس کی مثال ''**فر من المطر وقام تحت المیزاب**'' یعنی بارش سے بچنے کے لیے پرنالہ کے نیچے کھڑے ہونے کی ہے- ہر حال میں دلیلوں کی پیروی اور حق کا اتباع واجب ہے- کسی عالم وفقیہ کی وہی بات لائق اخذ واعتناء ہے جو دلیل سے مبرہن ہے اور ایسی صورت میں اصل اتباع، دلیل کا ہے نہ کہ اُس عالم کا- یہی وجہ ہے کہ خالی از دلیل یا مخالف دلیل قول کا متبعین کتاب وسنت کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں- چاہے اس کا قائل وقت کا بڑے سے بڑا عالم کیوں نہ ہو- لہٰذا سوال تو یہ مناسب تھا کہ مقلدیت کا وجود کب سے ہوا؟ کیونکہ اتباع اصل شئی ہے اور تقلید شئی حادث یعنی چوتھی صدی ہجری کی پیداوار- (سوال نمبر ۹/ اور ۱۰/ کا جواب اسی میں ہے)

مولانا وحید الدین خاں: -غیر مقلدیت کے آغاز کی قطعی تاریخ بتانا، شاید ممکن نہیں ہے- لیکن عام طور پر اس کا آغاز غالباً امام ابن تیمیہ سے شروع ہوتا ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -اس طرح کے کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو امت کی عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں- لیکن انہیں آپ شرذمہ قلیلہ کہہ سکتے ہیں- وہ امت کا عام رویہ نہیں ہے، اسے آپ امت کے Main stream سے کٹے ہوئے انحرافی نظریے کی پیداوار

کہہ سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ غیر مقلدیت کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا ہے- میرے نزدیک اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں، جسے ہم صحیح معنی میں غیر مقلد کہہ سکتے ہیں-

سوال (۱۰):- غیر مقلدیت نے امت کو ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزاد کرایا ہے یا کسی دوسری تقلید میں الجھا دیا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ایک نئی تقلید میں الجھا دیا ہے، آزادی تو جب ہوتی کہ ہر غیر مقلد مجتہد ہوتا اور الگ الگ اجتہاد سامنے آتا- یا کم از کم یہی ہوتا کہ مثلاً رفع یدین یا آمین بالجہر ،قرأت خلف الامام اور دوسرے صدہا مسائل میں کسی کو امام ابوحنیفہ کی دلیل وزنی معلوم ہوتی، کسی کو امام مالک کی، کسی کو امام شافعی یا امام احمد بن حنبل کی اور ہر ایک اپنی تحقیق کے مطابق آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عمل کرتا-

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں غیر مقلد جنگلی اور گنوار ہیں جن کے لیے صحیح طور سے سورۂ فاتحہ پڑھنا یا اردو میں لکھا ہوا ترجمہ قرآن سمجھنا بھی دشوار ہے، وہ اجتہاد یا تحقیق کیا کریں گے؟ کچھ غیر مقلد اگر عالم ہیں تو سب کا مذہب وہی ہے جو میاں جی اور ان کے معاصر وموافق رفقا نے ثبت قرطاس فرما دیا- کوئی شخص اس سے سرمو انحراف کرتا ہوا نظر نہیں آتا- نتیجہ سامنے ہے کہ نہ آزادانہ اجتہاد رہا، نہ آزادانہ تحقیق اور فکر وجستجو، ایک طے شدہ ،مقررہ اور احبار ورہبان کے ہاتھوں نئی کتابوں میں درج شدہ مذہب کی ''تقلید جامد'' رہ گئی- اجتہاد تو ان کے یہاں کچھ تھا نہیں ''تقلید سیال'' بھی رخصت ہوگئی-

مولانا وحید الدین خاں:- بطور واقعہ اس معاملے میں جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے امت تقلید سے آزاد نہیں ہوسکی، بلکہ وہ ایک نئی تقلید میں مبتلا ہوگئی ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- آپ کسی حدیث کو کہہ رہے ہیں کہ ضعیف ہے، کیوں کہہ رہے ہیں، اس لیے کہ اسے ذہبی نے بیہقی نے یا ابن کثیر نے ضعیف کہا- تو آپ کا اس حدیث کو ضعیف کہنا یہ تقلید ہوئی- تو جس طرح فن کے اندر آپ مقلد ہیں، تقلید کر رہے ہیں تو پھر احکام شریعت کے لیے جو فقہی اصول ہیں ان میں بھی آپ کو تقلید سے انکار کا حق نہیں پہنچتا- وہاں آپ کسی صاحب بصیرت کی ہی تقلید کر رہے ہیں جس نے کتاب وسنت سے

احکام استخراج کیے ہیں-

سوال (۱۱):- جماعت سلفیہ اور جماعت اہل حدیث میں کچھ فرق بھی ہے یا اختلاف صرف ناموں کا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- اصل میں غیر مقلدین کا جب وجود ہوا اور ابن عبدالوہاب کا اعتقادی مذہب انہوں نے اپنایا اور عمل میں مذاہب ائمہ سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو مقلدین نے انہیں وہابی یا لامذہب یا غیر مقلد کا نام دیا- کوئی نام انہیں پسند نہ آیا- انہوں نے ماضی کی صدیوں کا مطالعہ کیا، ماضی میں سلفی اور محدث یا اہل حدیث نام کے گروہ انہیں نظر آئے، یہ نام انہیں اچھے لگے اور انہیں سے اپنی تشہیر گوارا کر لی، کبھی اپنے کو محمدی یا اثری بھی کہتے ہیں، شاید اور زیادہ اچھے نام کی تلاش ابھی جاری ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- جماعت سلفیہ، جماعت اہل حدیث اور انصار السنۃ، وغیرہ میں کوئی فرق نہیں، یہ نہج صحابہ وتابعین یعنی مطلق کتاب وسنت، ثابت اجماع اور قیاس شرعی کو حسب ضرورت قبول کرنے والی جماعت کے مختلف نام ہیں اور جب مقصود ومنشور ایک ہو تو ناموں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا- ''لا مشاحة فی الاصطلاح''

مولانا وحید الدین خاں:- جہاں تک میں جانتا ہوں دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، ضمنی نوعیت کا فرق پایا جاسکتا ہے- لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، دونوں کے درمیان حقیقی نوعیت کا کوئی فرق موجود نہیں-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- دیکھیے! جب آدمی کے سامنے کوئی مضبوط بنیاد نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید حاصل نہ ہو تو اسی طرح انتشار پیدا ہوتا ہے- واقعہ یہ ہے کہ جب مامون کے زمانہ میں خلق قرآن کا مسئلہ سامنے آیا اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اور ان پر جبر کیا گیا تو انہوں نے صاف صاف یہی کہا کہ ہم نے کتاب وسنت میں کہیں ایسا نہیں پایا اور نہ اپنے اسلاف سے سنا کہ یہ مخلوق ہے- اس لیے ہم اسے مخلوق نہیں کہہ سکتے- بعد میں اسی بنیاد پر امام احمد ابن حنبل کو ماننے والے اپنے آپ کو سلفی بھی کہنے لگے تو عالم عرب میں دراصل حنابلہ کو سلفی

کہا جاتا ہے، جو امام احمد ابن حنبل کے مقلد ہیں اور آج بھی عالم عرب میں وہی سلفی ہے جو حنبلی ہے، غیر مقلدیت کا تعلق سلفیت سے کچھ بھی نہیں ہے- غیر مقلدیت درحقیقت کتاب وسنت کی بابصیرت رہنمائی سے انحراف کا نام ہے اور جہاں تک اہل حدیث کا معاملہ ہے تو یہ بھی عجیب وغریب ہے- پہلے یہ محمدی تھی اور پھر اہل حدیث ہو گئے، پھر اپنے آپ کو سلفی کہنے لگے- یہ اس وقت ہوا جب عالم عرب میں پڑول نکلنا شروع ہوا اور یہاں کے اہل حدیث کے رابطے وہاں سے ہو گئے- اس سے قبل آپ کسی بھی اہل حدیث کے ساتھ سلفی لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے تو اس کو ہم کیا کہیں کہ کل تک تو اہل حدیث رہے اور آج اچانک سلفی ہو گئے- اسی لیے ہمیں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ جن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی وہ اسی طرح سے اپنا نام بدلتے رہتے ہیں-

مولانا محمد حسین بٹالوی نے برٹش حکومت کے زمانہ میں اپنے طبقہ کا نام اہل حدیث رجسٹرڈ کرایا تھا- اس سے پہلے وہ محمدی کہلاتے تھے، تو بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے آدمی ہر طرف لڑھکتا رہتا ہے-

اب رہا ہندوستانی اہل حدیث اور عالم عرب کی جماعت سلفیہ کے بیچ تقابل کی بات تو عالم عرب میں جتنے بھی سلفی ہیں، تقریباً سب کے سب مقلد ہیں، ہندوستانیوں کی طرح مخالف تقلید نہیں، پھر عموماً وہ حنبلی ہیں اور تھوڑے بہت شافعی اور مالکی بھی ہیں، لیکن ہندوستان کے اندر اہل حدیث کا جو نظریہ ہے اور مخالفت تقلید کی جو لہر ہے، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے- ہاں! اس کے باوجود اب ہندوستانی اہل حدیث ان کے ساتھ روابط کو بڑھانے کے لیے ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرور کوشش کر رہے ہیں-

علامہ شوکانی یمن کے ایک زیدی شیعہ تھے، انہوں نے تقلید کی مخالفت کا آغاز کیا اور ایک نئی روش پیدا کی تو ان کے بعد سے ہی یہ انحرافی رویہ چلا ہے- رہا علامہ ابن تیمیہ یا علامہ ابن قیم کا ذکر، جن کا یہ حضرات بہت چرچا کرتے ہیں تو خود وہ بھی غیر مقلد نہیں تھے، وہ سب کے سب مقلد تھے، حضرت غوث اعظم بھی مقلد تھے، اب یہ کہ بعض مسائل میں انہوں نے اختلاف کیا تو یہ ان کے اپنے تفردات ہیں، جیسے حنفیوں میں علامہ ابن ہمام کے تفردات

ہیں، شاہ ولی اللہ کے تفردات ہیں، وغیرہ وغیرہ- علامہ ابن تیمیہ کے جتنے تفردات ہیں سب کی تعداد ۷۰/۷۲ ہے اور باقی مسائل میں وہ خود بھی مقلد ہیں، ان کو اہل حدیث غیر مقلد کہنا بالکل غلط ہے-

سوال (۱۲):- جماعت اہل حدیث کا اختلاف صرف فقہی ہے یا نظری واعتقادی بھی ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- غیر مقلدین اعتقاداً کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے پابند ہیں اور عملاً ایک نئی تشکیل اور جدید تدوین کے، دونوں کی کچھ تفصیل جامع الشواہد میں محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ نے دی ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- جماعت اہل حدیث پورے اسلام کی نمائندہ جماعت ہے، اور وہ مخالف کتاب وسنت واجماع صحیح کسی عقیدہ وعمل یا فکر ونظر کو قبول نہیں کرتی- ویسے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے عقائد کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور بنیادی طور پر ان کے درمیان عقیدہ کے باب میں کوئی قابل ذکر ولحاظ اختلاف نہیں ہے- صوفیہ اور خانقاہیوں کے درمیان مروجہ عقائد میری مراد نہیں ہیں، کیونکہ ائمہ اربعہ میں سے بعض کی طرف انتساب کرنے والے بہت سے لوگ عقائد کے اعتبار سے اشعری اور ماتریدی ہیں اور تصوف کے متعلق مزید چار سلسلے رائج اور مشہور ہیں، جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں-

مولانا وحید الدین خاں:- جہاں تک میں جانتا ہوں، جماعت اہل حدیث کا اختلاف دونوں نوعیت کا ہے- فقہی مسائل کے اعتبار سے بھی اور اعتقادی مسائل کے اعتبار سے بھی-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- غیر مقلدین کے زیادہ تر اختلافات فقہی ہیں، لیکن کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو نظریاتی ہیں، یہ نظریاتی اختلافات ان لوگوں نے شیخ ابن تیمیہ کے اتباع میں اپنا لیے ہیں، مثلاً یہ کہ اللہ فوق میں ہے اور یہ کہ انسانوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہیں، تو اس طرح کے نظریاتی اختلاف کے اندر اگر ہم احتیاط کریں اور ان کی تکفیر نہ کریں تو کم از کم وہ گم راہ تو ہیں ہی- ان کی گمرہی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا-

سوال (۱۳):-غیر مقلدیت نے ''دعوۃ الی الکتاب والسنۃ'' کے نام پر امت کو متحد کیا یا اس کے انتشار کے مزید سامان بہم پہنچا دیے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-امت ائمہ اربعہ کو برحق مانتے ہوئے اپنے اپنے امام کی تقلید پر مطمئن تھی، غیر مقلدیت کے وجود میں آتے ہی انتشار اور جنگ وجدال کا ماحول برپا ہو گیا-فوجداری، مقدمہ کورٹ، کچہری سب کی نوبت آئی اور سلسلہ اب بھی جاری ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-اہل حدیث اور انصار السنۃ، امت کو یقیناً کتاب وسنت اور اعتصام بحبل اللہ کے پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے آرزومند ہیں-اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے اور کوششوں کو بارآور کرے-جماعت اہل حدیث نے ہمیشہ امت کو انتشار سے بچانے اور شاہراہ قرآن وحدیث پر متحد کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے-پہلے بھی امت کا اتحاد کتاب وسنت پر قائم تھا اور آج بھی اسی متحدہ پلیٹ فارم پر اتحاد قائم اور راسخ ہوسکتا ہے-کاش! لوگ غور وفکر سے کام لیتے-

مولانا وحید الدین خاں:-اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کوشش کا عملی نتیجہ منفی صورت میں نکلا ہے اور اس کا سبب غلو ہے-جب بھی غلو کا طریقہ اختیار کیا جائے گا ہمیشہ اس کا نتیجہ منفی صورت میں برآمد ہوگا-

مولانا عبدالحمید نعمانی:-ہر باطل تحریک ایک خوشنما نام کے ساتھ سامنے آتی ہے-معتزلہ کی تحریک اصحاب العدل والتوحید کے نام سے اٹھی تھی-لیکن ظاہر ہے کہ وہ گمرہی تھی، قادیانیت کی تحریک کو دیکھیے وہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک، خدا کی نعمت کی تحریک بتا رہے ہیں، تو اس طرح کی جتنی تحریکیں ہوتی ہیں، کسی خوب صورت نام کے ساتھ ہی سامنے آتی ہیں اور یہ باطل کی کمزوری ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی اصلیت کو واضح کر کے سامنے نہیں آسکتی-شیطان اپنی ہر شیطانی کو خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے، اس طرح کی تمام انحرافی تحریکوں کا یہی حال ہے، ان کا کتاب وسنت کی دعوت یا اتباع شریعت کے جذبے سے اصلا کوئی تعلق نہیں ہوتا، آج بھی وہ لوگ جو اسلاف کے حقیقی معنی میں اتباع کرتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور اولیاء اللہ کا احترام کرتے ہیں، ان کے اندر اتباع شریعت کا

جذبہ ان سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو صرف کتاب وسنت کے نام سے اپنا کام چلانا چاہتے ہیں، کون کتاب وسنت کی پیروی کو اولین اور بنیادی فریضہ نہیں سمجھتا؟ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطالبات پر زیادہ سے زیادہ عمل کرے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کتاب وسنت کی دعوت نے لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف متوجہ نہیں کیا ہے، بلکہ دین کے اتباع پر جو سماج قائم تھا، اس میں انتشار وخلفشار پیدا کر دیا ہے اور عوام ذہنی طور پر سخت الجھن کا شکار ہو گئے ہیں-

سوال (۱۴):-عالمی تناظر میں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کے منفی کردار میں اس کی غیر مقلدیت کا کیا کردار ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:-سعودی عرب میں رہنے والے شیوخ نجد کو غیر مقلدیت سے زیادہ عقیدۂ وہابیت سے دلچسپی ہے اور اس کو وہ طاقت، دولت، افراد وغیرہ کے ذریعہ پھیلانے میں منہمک ہیں، وہ حنبلیت کے مدعی ہیں، مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مصلے مسجد حرام سے ختم کر دیے-تعظیم واحترام کو عبادت اور شرک کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار ومقابر کو اصنام کا درجہ دیتے اور ان کی شکست وریخت کو بت شکنی سمجھتے ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:-سعودی عرب کے کردار پر لوگوں کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں-میرا حسن ظن ہے کہ سعودی عرب کی اسلامی حکومت امت مسلمہ کے مفاد میں کام کر رہی ہے اور ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' کے تحت وہ جو بھی قدم اُٹھا رہی ہے اس کے پیچھے دور رس مقاصد کارفرما ہیں-دور دراز علاقوں میں بیٹھے اور جھوٹ وبے سروپا باتوں کی اشاعت کرنے والے میڈیا کے دام فریب میں مبتلا حضرات کو خواہ مخواہ اس مملکت سے بدگمانیاں اور خدا را بیر ہیں، جب کہ یہ حکومت بفضلہ تعالیٰ شدت پسندی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہی ہے اور آج بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی دہشت گردی سے نبرد آزما رہے گی-حکومت کا منشور اتباع کتاب وسنت اور رد بدعت کے ساتھ امت مسلمہ کی خیر خواہی ہے اور شاید ان ہی اصولوں پر کاربند ہونے کے سبب مسلمانوں کے بعض طبقات کو اس حکومت سے بلاوجہ ردوکد

ہے- ویسے میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ حکومت اپنے ہر فیصلہ اور اقدام میں درست ہے، لیکن بہرحال اس کے محاسن، معائب پر غالب ہیں اور اگر کسی کو کوئی خامی وخرابی نظر آتی ہو تو دین خیر خواہی کا نام ہے- اس کو چاہیے کہ حکومت یا اس کے سفارت خانے سے رجوع کرے-

مولانا وحید الدین خاں:- جہاں تک میں جانتا ہوں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کا کوئی منفی کردار نہیں ہے اور اگر ہے تو مجھے اس کا علم نہیں-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- دیکھیے! ہم لوگوں نے جو دیکھا ہے، جو سمجھا ہے اور رابطہ ہونے کے بعد جب بات چیت ہوئی ہے تو اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سعودی حکومت اور وہاں کے ذمہ داران کا غیر مقلدیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، چاہے محمد بن عبد الوہاب ہوں چاہے آج کے دوسرے ذمہ داران ہوں، آل شیخ وغیرہ- ان کا تحریری بیان موجود ہے کہ ہم ائمہ اربعہ کی توہین کے خلاف ہیں، ہم چاروں ائمہ کا احترام کرتے ہیں اور ہم لوگ حنبلی ہیں اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے اسلاف کا رہا ہے- لیکن یہ لوگ جو ہندوستان میں اہل حدیث اور غیر مقلد کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ اپنے آپ کو وہاں کی سلفیت سے جوڑ کر ایک طرح کی غلط فہمی اور مغالطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ سعودی حکومت کا وہاں بالکل ایسا کردار نہیں ہے کہ وہ غیر مقلدیت کو اہمیت دے- جب جمعیۃ العلماء نے تحفظ سنت کانفرنس میں یہ سوال اٹھایا تھا تو وہاں کے ذمہ داروں نے باضابطہ کہا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے- لیکن ہاں! کچھ لوگ وہاں اس طرح کے نظریات کے حامل ضرور ہیں، جو بااثر بھی ہیں-

سعودی کے اندر چوں کہ دو طبقات ہیں، ایک حکومت کا طبقہ ہے جسے آل سعود کہا جاتا ہے اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جسے آل شیخ کہا جاتا ہے- آل شیخ کے اندر کچھ لوگ ایسے ضرور رہے ہیں، جن کے اندر آزادی کا پہلو ابھرا ہوا ہے- لیکن ان کو آپ برصغیر میں جو معروف معنی میں اہل حدیث اور غیر مقلد کی اصطلاح ہے، اس معنی میں انہیں اہل حدیث یا غیر مقلد نہیں کہہ سکتے- لیکن وہاں پر جو حکومتی طبقہ ہے، ان کا جو مزاج ہے، اس سے بالکل ایسے آزاد رویہ کی تائید نہیں ہوتی ہے- حکومتی افراد تقریباً سب کے سب مسلکاً حنبلی ہیں- اس لیے یہ نہیں کہا جا

سکتا کہ حکومت کی وجہ سے غیر مقلدیت کو فروغ ہو رہا ہے- ہاں! لیکن یہ جو میں نے کہا کہ یہ لوگ کنفیوژن پیدا کرتے ہیں، تو یہ اپنے اس حربہ سے کہ وہاں پر اپنے کو ان کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یہاں پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سعودی میں ہمارے ہی نظریات کے لوگ ہیں- اس حربے سے ان کو ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ اپنا فروغ کرتے ہیں-

سوال (۱۵):- کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اگر ہاں! تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو عصر حاضر میں تحقیق واجتہاد کی کون سی صورت ممکن یا واجب ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- اجتہاد کی اجازت اہلیت سے مشروط ہے اور وہ صدیوں سے مفقود ہے، مگر ائمہ نے جامع اصولوں کی روشنی میں فروع کا جو ذخیرہ ہمیں دیا ہے، اس میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کا حل بعینہٖ مل جاتا ہے اور کچھ کے لیے نظر وفکر اور الحاق کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ کام انفرادی واجتماعی طور پر ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور آج بھی جاری ہے- اسی لیے مقلدین کے یہاں ہر نئے مسئلے کا حل مل جاتا ہے اور غیر مقلدین کے یہاں بے شمار پرانے مسائل بھی تشنہ ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- اجتہاد کا دروازہ کس نے اور کب بند کیا کہ آج اس کے کھولنے کی ضرورت پیش آئی؟ مسائل لامتناہی ہیں اور شرعی اصول کے اندر ان کے حل کی پوری صلاحیت موجود ہے اور ماشاءاللہ متجددہ مسائل کے اندر امت کی رہنمائی کرنے والے علمائے راسخین سے بھی یہ دنیا خالی نہیں ہے- ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قیاس واجتہاد کے اصول کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس بحر کی شناوری وہی لوگ کریں جو اس کے اہل ہیں.....ع ..... ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

مولانا وحید الدین خاں:- کچھ علماء کا یہ کہنا ہے کہ فقہائے اربعہ کے بعد کے زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے- اس رائے کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک بعد کے زمانے میں علم کا رسوخ کم ہو گیا- یہ سبب اس ضمن میں بلاشبہ بے اصل ہے- کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ اجتہادی خطا پر بھی آدمی کو ایک ثواب ملتا ہے- میرے نزدیک اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہو سکتا ہے- میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ

اجتہاد ایک عبادت ہے اور عبادت کبھی بند نہیں ہوتی، اس سلسلے میں جو اصل بات ہے، وہ یہ ہے کہ اگر عالم کی نیت درست ہے تو اس کو اپنے اجتہاد کا ثواب ملے گا اور اگر اس کی نیت درست نہیں ہے تو اس کو اس کا ثواب نہیں ملے گا-

عصر حاضر میں اجتہاد کی ایک لازمی ضرورت یہ ہے کہ عالم علم شریعت کے ساتھ علم زمانہ سے بھی بخوبی طور پر آگاہ ہو- مثال کے طور پر وہ عربی زبان کے علاوہ انگریزی زبان کی اچھی استعداد رکھتا ہو تا کہ اس کی پہنچ جدید مصادر تک ہو سکے- اس دو طرفہ علم کے بغیر کوئی شخص موجودہ زمانہ میں کامیاب مجتہد نہیں بن سکتا-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- اجتہاد کا دروازہ دور رسالت سے کھلا ہوا ہے، یہ دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک مسائل میں اجتہاد ہوتا رہے گا- امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین نے یہی لکھا ہے- اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے تو عصری مسائل جو پیش آتے ہیں، ان کا حل کیسے پیش کیا جا سکے گا- اصل مقصد مسائل کا حل ہے- خواہ یہ اجتماعی سطح پر ہو خواہ انفرادی سطح پر، آج اجتہاد کا عمل اجتماعی سطح پر بہتر انداز میں ہو رہا ہے- اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور نہ بند کرنے کا کسی کو حق ہے، آج چوں کہ مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ہر مسئلے میں جدید و قدیم کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے پہلو پیدا ہو گئے ہیں- پھر اجتہاد کے لیے جس طرح کی صلاحیت اہل علم میں چاہیے تھی تقریباً مفقود ہے، کوئی ایک آدمی ایسا نظر نہیں ہوتا جو خود ہی سارے مسائل کو حل کر دے، ایسی صورت میں اجتماعی اجتہاد بہت ہی بہتر اور قابل تعریف عمل ہے-

سوال (۱۶):- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے پیغام؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ''جام نور'' خوب سے خوب تر، مفید سے مفید تر کی جستجو میں جادہ پیما ہے، اسی بنیاد پر قارئین بھی اس کے دل دادہ ہیں- دونوں کا سفر استقامت اور روز بروز ترقی کے ساتھ جاری رہے، یہی آرزو اور یہی پیغام-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- ماہنامہ جام نور کے مدیران اور مقالہ نگاران سے یہی گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کریں، اسلام کے اصل الاصول کتاب اللہ اور سنت

مصطفےٰ ﷺ کی بالا دستی کے لیے اشہبِ قلم کو مہمیز لگائیں اور بدعات و خرافات نیز جذبات وعواطف سے پرہیز کریں اور قارئین کرام حق وصواب کی جستجو میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں، اپنے آپ کو بدعقیدگی اور عملی انحطاط سے محفوظ رکھیں، زور بیان و قلم اور علمائے سوء کی لن ترانیوں سے متاثر نہ ہوں، بلکہ قرآن وسنت پر مبنی دلائل تلاش کریں اور انھیں کو حرز جاں بنائیں کیوں کہ معاملہ دین کا ہے اور الحمد للہ اللہ کا دین دلائل صحیحہ پر مبنی ہے- اللہ تعالیٰ حق کے کاموں پر ہم تمام لوگوں کا حامی و ناصر ہو- **والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین-**

مولانا وحید الدین خاں:- ماہنامہ جام نور میرے پاس آتا ہے، میں اس کو ایک اچھا رسالہ سمجھتا ہوں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری دعاء ہے کہ ماہنامہ جام نور ہمیشہ ترقی کرتا رہے اور مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث بنے-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- ہمارا پیغام یہی ہے کہ کتاب وسنت سے ہماری وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہو اور جو صحابہ اور اکابر اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا عمل ہے، جو توارث ہے، اس سے ہمارا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے- اگر ہمارا رشتہ ان چیزوں سے چھوٹ جائے گا تو کتاب وسنت پر عمل کا دعویٰ مشکوک ہو جائے گا- آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے جذبات کو صحابہ و تابعین، بزرگان دین و صالحین سے کم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے- لیکن سچائی یہ ہے کہ جب تک ان لوگوں سے ہماری وابستگی، عقیدت مندی مستحکم نہیں ہوگی، عمل میں وہ جذبہ صداقت نہیں آ سکے گا-

ہمارا بنیادی مقصد تو بلا شبہ کتاب وسنت پر عمل کرنا ہی ہے- لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کو اپنا باغی سمجھیں، ہاں! اگر کسی مسئلے میں کسی سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو تو ہم انہیں مطعون کرنے کی بجائے معذور سمجھیں گے- انہیں مطعون کرنا قطعی طور پر غلط ہے- انہیں معذور سمجھتے ہوئے کتاب وسنت کا جو صحیح منشا ہے اور جس پر امت عامل رہی ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو کتاب وسنت، اجماع امت اور اکابر کے توارث کے خلاف ہو اور نہ کسی طرح اپنے اندر اسلاف سے غلط فہمی پیدا ہونے دیں- □□□

انقلاب ۱۸۵۷ء

۲۰۰۷ء انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰/سالہ یادوں کا سال ہے، یہ یادیں ہمارے لیے کئی جہتوں سے مفید بھی ہیں اور فکر انگیز بھی، یہ سال خاص طور پر ہمیں عصر حاضر میں آزادی وغلامی کے مسئلے پر غور کرنے، اپنا محاسبہ کرنے اور گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں مسلمانوں نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے- اس خصوص میں ہم نے انقلاب ۱۸۵۷ء پر ماہنامہ جام نور کا ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا اور عصر حاضر کے دو عظیم اسکالر پروفیسر سید عزیز الدین احمد استاذ شعبۂ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور مولانا یٰسین اختر مصباحی دارالقلم دہلی و سابق مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''حجاز جدید'' دہلی کے خیالات بھی جاننے کی کوشش کی- اس موضوع کے لیے ان دونوں اسکالروں کے انتخاب کی وجہ یہ بنی کہ دونوں کا تاریخ سے خصوصی تعلق ہے اور دونوں ہی ۱۸۵۷ء پر علمی وتحقیقی کام کرنے میں مصروف ہیں- مولانا یٰسین اختر صاحب کی ۲۰۰۷ء میں پانچ کتابیں ''انگریز نوازی کی حقیقت''، ''چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء'' ''علما وقائدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' ''انقلاب ۱۸۵۷ پس منظر وپیش منظر'' اور ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور علامہ فضل حق خیرآبادی'' شائع ہو چکی ہیں اور کئی دوسری زیر اشاعت یا زیر تالیف ہیں، دیگر زاویوں سے ان کی شخصیت قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں، پروفیسر سید عزیز الدین صاحب ۲۹/دسمبر ۱۹۵۲ء علی گڑھ میں پیدا ہوئے، علی گڑھ سے ہی تاریخ میں ایم اے کیا جبکہ پی ایچ ڈی کی تکمیل جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کی اور یہیں استاذ مقرر ہوئے- ان کے ریسرچ کا موضوع ''عہد اورنگ زیب عالمگیر'' تھا، تاریخ میں اردو اور انگلش میں ۹۲/ مضامین کے علاوہ پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ۲۰۰۷ء میں ان کی نئی کتاب 1857 Revisited آئی ہے جو کافی چرچے میں ہے-

سوال (۱):- بہادر شاہ ظفر اور ان کے پیش رؤوں کی آخر وہ کون سی کمزوری تھی جس نے انہیں اقتدار سے بے دخلی اور غلامی تک پہنچا دیا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:- دیکھیے! اس کے لیے ہمیں تاریخ میں جانا ہوگا، مغل سلطنت کا زوال ۱۸/ویں صدی میں شروع ہوا، یہ صنعتی انقلاب کا دور تھا، اس زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغل سلاطین اس دور کو نہ سمجھ سکے، وہ صنعتی دور میں بھی جاگیردارانہ نظام کو زبردستی چلانے کی کوشش کرتے رہے- تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ہم اپنی ''سوچ'' کو Developed نہیں کر سکے اور یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ یہ دور کیسا ہے اور اس کے چیلنجیز کیا ہیں؟ اور کن طریقوں سے ہم یوروپی طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اس کو آپ اس مثال سے سمجھیے کہ اگر کوئی میز پرانی ہو جائے اور وہ پرانی ہو کر ٹوٹ جائے اور ہم اسے چولہے میں جلانے کی بجائے پھر نئے سرے سے ٹھوک ٹھاک کر کھڑی کر دیں تو میز پھر ٹوٹ جائے گی، کیوں کہ لکڑی کمزور ہو گئی ہے، اس میں کیلیں ٹھونکنے سے وہ اور کمزور ہوتی چلے جائے گی- یہی حال مغل دور میں جاگیردارانہ نظام کا تھا، وہ نظام کمزور ہو گیا تھا اور مغل حکمران زبردستی اسے نافذ رکھنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ سامنے آیا-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے برطانوی تاجروں کو اس کی باضابطہ اجازت دی کہ وہ ہندوستان کے اندر تجارت کر سکتے ہیں، اس وقت جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا، برطانوی تاجروں نے بہت محدود اور چھوٹے پیمانے پر معمولی سرمائے سے ہندوستان کے اندر اپنا کاروبار شروع کیا، اپنے کاروبار کو منظّم اور مربوط کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور کچھ دنوں بعد سورت (گجرات) کے اندر کمپنی سے وابستہ افراد اپنی تجارتی کوٹھی بنانے میں کامیاب ہوئے اور ابتدائی مرحلے میں وہیں سے اپنی تجارت اور اس کی سرگرمیاں بڑھانے اور پھیلانے میں شب و روز مصروف ہوئے-

دوسرے مرحلے میں کلکتہ کے قریب ہگلی میں بھی کمپنی نے اپنی ایک تجارتی کوٹھی بنالی-

تیسرے مرحلے میں اس نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور مدراس کے آس پاس ایک قلعہ نما سینٹر بنایا- اسی طرح اڑیسہ میں بھی کمپنی نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے، لیکن کمپنی کا زیادہ زور بنگال میں رہا اور رفتہ رفتہ کمپنی نے اتنا منافع کمایا کہ برطانیہ کو اس کا نہایت حوصلہ افزا مالی فائدہ پہنچا- تاریخی مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمراں برطانوی تاجروں کے اصل عزائم بھانپنے میں ناکام رہے، اکبر کے بعد نورالدین جہاں گیر اور اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں بھی انگریزوں کے تجارتی لبادے کے اندر چھپے ہوئے اغراض و مقاصد تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی- صرف شائستہ خاں جو بنگال کا گورنر تھا اس نے اس طرف توجہ دی اور برطانوی تاجروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، کئی ایک سخت اقدامات کیے مگر ان کا تسلسل باقی نہ رہ سکا اور گھوم پھر کر انگریز وہی کرنے میں مصروف رہے جو ان کا اصل نشانہ تھا-

جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی نے انگریزوں کی اصل خواہشات کو تاڑتے ہوئے شدید مزاحمت کی، لیکن نظام حیدر آباد اور مراٹھوں سے ساز باز کر کے انگریز اپنے آپ کو بچاتے رہے- حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں سے لڑتے ہوئے بیتی، مگر وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا- یہی حال ٹیپو سلطان کا بھی رہا، یہاں تک کہ ٹیپو نے فرانس اور ترکی تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ان کے تعاون سے انگریزوں کی جڑ بنیاد سے اکھیڑا جا سکے- مگر بدقسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوا-

ادھر شمالی ہند میں اپنے استحکام کے بعد انگریزوں نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال بچھا دیا- انہوں نے ایک طرف ہندوستان کی زراعت و تجارت و صنعت وغیرہ پر پنجے گاڑ دیے اور دوسری جانب اپنی حکمت عملی سے کرسی حکومت و اقتدار کی طرف بڑھنا شروع کیا اور اس کے لیے مال و زر اور دھونس دھمکی کی ساری تدبیریں اپناتے ہوئے راجوں، مہاراجاؤں، نوابوں، زمین داروں، تاجروں، بنیوں کے درمیان ایسے وفادار غدار پیدا کیے جو ان کے اشارۂ ابرو پر رقص کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے- جب بات حد سے زیادہ بڑھی تو شمالی ہند میں بھی محاذ آرائی کی نوبت آنے لگی اور پہلی باقاعدہ جنگ پلاسی (بنگال) کے میدان میں علی وردی خاں کے نواسے نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے

درمیان ۱۷۵۷ء میں ہوئی، اس کے بعد نواب شجاع الدولۃ سے بکسر (بہار) کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں، پھر حافظ رحمت خاں روہیلہ سے روہیل کھنڈ (موجودہ یوپی) کے اندر ۱۷۷۴ء میں ہوئی اور آخری فیصلہ کن جنگ سرنگہ پٹنم (جنوبی ہند) میں ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو سے ہوئی جس میں ان کی شہادت کے بعد ان کی لاش کے قریب کھڑا ہو کر ایک انگریز کمانڈر نے اعلان کیا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے-

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغل حکومت کے زوال وانحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا اور جتنے بھی مغل بادشاہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کے تخت وتاج کے وارث ہوئے وہ عزم و ہمت، بہادری و اولوالعزمی اور تدبیر جہاں بانی جیسی صفات سے عاری تھے اور ان کے اندر اتنی صلاحیت واستطاعت نہیں تھی کہ پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ اور سکہ برقرار رکھ سکیں- دوسری جانب انگریز نہایت شاطر اور عزم وحوصلہ سے بھرپور تھے- اس لیے نہ مغل حکمران ان کی راہ میں حائل ہو سکے نہ ہی نواب اور راجا مہاراجا ان کا کچھ بگاڑ سکے- بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں انگریزی فوج نے دلی پر دھاوا بول دیا اور شاہ عالم کو ایک ایسے معاہدے پر مجبور کر دیا جس کی رو سے شاہ عالم کی برائے نام بادشاہت باقی رہے، لیکن عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے رہے- ٹھیک یہی حال اس سے پہلے لکھنؤ میں ہو چکا تھا کہ ۱۸۰۱ء میں نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے ایک ایسے ہی معاہدے کا پابند بنا دیا تھا-

بعد کے حالات میں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ پر اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت اور نواب واجد علی شاہ کی نوابی کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو گیا اور انگریز بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان کے حکمراں بن گئے-

سوال (۲):- انقلاب ۱۸۵۷ء کے محرکات میں سب سے اہم کیا تھا، سیاسی، مذہبی، معاشی، قومی، اخلاقی یا اور کچھ؟ نیز اس انقلاب میں سب سے نمایاں کون سا طبقہ تھا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:- جہاں تک ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا سوال ہے تو اس کے اسباب میں یہ سب چیزیں شامل تھیں، ان اسباب میں سیاسی بھی تھے، مذہبی بھی تھے

اور ثقافتی بھی لیکن میرا خیال ہے کہ معاشی سبب سب سے اہم تھا، کیوں مغل دور حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، لیکن جب سے انگریز آئے وہ انہیں اعلیٰ مناصب سے چھانٹتے گئے اور ان کو نوکریوں سے محروم کرتے گئے، مسلمانوں کے پاس اور کوئی پروفیشن نہیں تھا، اسی طرح معاشیات کے جو ذرائع تھے وہ مسلمانوں کے لیے بند ہونا شروع ہو گئے، اس سے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے تئیں خطرات لاحق ہو گئے، سرسید نے جو اسباب بغاوت کے تعلق سے دو کتابیں لکھیں، سرکشی ضلع بجنور جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی اور اسباب بغاوت ہند جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، ان میں انہی باتوں کی طرف خصوصی اشارہ ہے، ان میں مذہب بھی ہے، انگریزوں نے مساجد کو توڑا اور تمام مذہبی قدروں میں دخل دینا اور انہیں آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کیا- صرف اسلام ہی نہیں ہندو دھرم کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا، تو یہ تمام باتیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شامل تھیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب میں نہ صرف بادشاہ، راجہ اور نواب بلکہ عوام بھی پورے طور پر سرگرم تھے- اس کو اس مثال سے سمجھیے کہ بہادر شاہ ظفر تو قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے، انگریزوں نے ۱۴ر ستمبر کو کشمیری گیٹ کو توڑا اور دہلی میں داخل ہوئے، لیکن کشمیری گیٹ سے لال قلعے تک پہنچنے میں انہیں پانچ دن کا وقفہ لگا- تو جب بادشاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے تو بظاہر تو یہ ہونا تھا کہ عوام Surrender کر جاتے، لیکن نہیں، وہ پانچ دن تک انگریزوں سے لڑتے رہے-

جہاں تک سوال کے اس حصے کی بات ہے کہ اس انقلاب میں پیش پیش کون سا طبقہ تھا؟ تو ہم اس میں کچھ تعین نہیں کر سکتے، بہادر شاہ ظفر بھی ہیں، تانتیہ ٹوپے بھی ہیں، بہادر شاہ کے بیٹے بھی ہیں، نواب بھی ہیں، راجہ بھی ہیں- بلکہ اس انقلاب کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جن لوگوں کے بارے میں سمجھتے تھے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گے انہوں نے ساتھ نہیں دیا اور جن پر ان کو اعتماد نہیں تھا انہوں نے ساتھ دیا، جیسے نواب جھجھر عبدالرحمٰن خان پر بادشاہ کو اعتماد تھا، لیکن انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا ساتھ نہیں دیا- دوسری طرف بلبھ گڑھ کے راجہ نہال سنگھ پر بادشاہ کو اعتماد نہیں تھا، لیکن انہوں نے سلطان کا بھرپور ساتھ دیا اور انگریزوں کا خوب مقابلہ کیا، جس کی پاداش میں انگریزوں نے چاندنی چوک پر انہیں سولی پر چڑھا دیا-

راجہ نہال سنگھ کا ایک دلچسپ خط بھی ہے بہادر شاہ ظفر کے نام، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ آپ کو میرے خلاف ورغلا رہے ہیں، حالاں کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں بلبھ گڑھ کا راجہ بنا تو یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، میں نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور ایک عیدگاہ تعمیر کرائی-تو یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے مسلم نواب بہادر شاہ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور ہندو راجہ جن پر بادشاہ کو مکمل اعتماد نہیں تھا وہ پورے طور سے ساتھ دے رہے تھے-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-انقلاب ۱۸۵۷ء کا کوئی ایک سبب نہیں، بلکہ اس کے متعدد اسباب و وجوہات تھے، ہندوستانی عوام اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری زمینی پیداوار کا اصل فائدہ انگریز اٹھا رہے ہیں- ہماری تجارت اور صنعت کو انہوں نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اس کا اصل فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا ہے-ہمیں یا تو اَن پڑھ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے یا ایسی تعلیم ہمارے بچوں کو دینے کے طریقے اور تدبیریں اپنائی جا رہی ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد ظاہر میں وہ تو ہندستانی رہیں لیکن ان کا دل و دماغ انگریزوں جیسا ہو جائے- ہمارے سماجی ڈھانچے توڑنے کی اور ہندو مسلم منافرت پھیلانے کی انگریز لگاتار کوشش کر رہے ہیں، اپنے پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعے ہمارے مذہب پر نہ صرف حملے کیے جا رہے ہیں بلکہ ہمیں عیسائی بنانے کی اعلانیہ کوشش ہو رہی ہے- ہمارے معزز شہریوں کو ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے، ہمارے علما کی توہین کی جا رہی ہے اور سات سمندر پار سے آکر ہمارے اوپر حکومت کی جا رہی ہے- یہ وہ مجموعی اسباب ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کی بنیاد ہیں، تاہم مذہب ایک ایسا عنصر ہے، جو سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اہم ترین سبب یہی خوف ہے کہ ہمیں یا ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنا دیا جائے گا- چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی در پردہ کوششوں کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنہوں نے ۱۸۴۶ء سے دلی، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اپنی خفیہ مہم کا جال پھیلا رکھا تھا اور میرٹھ کے انقلابیوں میں بھی ان کے آدمی اپنا کام کر رہے تھے- چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بارک پور (کلکتہ) اور مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے انقلابیوں نے گائے اور خنزیر کی ملی ہوئی چربی والے کارتوس کو دانت سے کاٹنے سے انکار مذہبی بنیاد پر ہی کیا تھا- اور ۱۰ر مئی کو میرٹھ سے چل کر جب ۱۱ر مئی کی صبح کو ۸۵ر انقلابیوں

کا دستہ دہلی میں داخل ہوا تو وہ بھی دین دین دھرم دھرم کے نعرے لگا رہا تھا-

دہلی و روہیل کھنڈ اور اودھ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصل میدان کارزار تھے اور صحیح معنوں میں علمائے کرام کے فتاویٰ اور ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی مجاہدین اور انقلابیوں کا اصل سرمایہ تھا، مشورے اور اقدامات میں علمائے کرام کی رہنمائی ہر جگہ ضروری سمجھی جاتی تھی اور علماء کی پشت پناہی نے ہی انہیں حوصلہ بخشا تھا- اس لیے علمائے کرام کا طبقہ ہی سب سے اہم تھا جس کی نمائندگی مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدارسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی کفایت علی کافی مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا وہاج الدین مرآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کر رہے تھے-

سوال (۳):-انگریزوں کے خلاف فتوی جہاد کس نے دیا تھا اور اس کے انقلاب ۱۸۵۷ء پر کیا اثرات مرتب ہوے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-فتوی جہاد کا آغاز شاہ عبدالعزیز سے شروع ہوا، پھر بعد میں دہلی کے بہت سارے علماء نے فتوی جہاد دیا اور نہ صرف دہلی کے بلکہ علی گڑھ، مرادآباد اور دوسرے مقامات کے علما نے بھی اپنے اپنے طور پر فتوی جہاد صادر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی اپنی مسجد میں جمعہ کے خطبات میں انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں اور عوام کو ان سے لڑنے کی ترغیب دلائی- اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جوش وجذبہ بھڑک اٹھا اور وہ آمادۂ جنگ ہو گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بعد میں انتقام بھی زیادہ مسلمانوں سے لیا، سب سے زیادہ مسلمانوں کو کچلا، پھانسی دی، برباد کیا، کالا پانی بھیجا، اتنی سخت کارروائی انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہیں کی-تو یہ جو کچھ ہوا سب کے سب فتوی جہاد کا ردعمل تھا-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف دیے جانے والے فتاوے جہاد کی متعین تعداد یقینی طور پر کسی مورخ نے نہیں لکھی ہے، البتہ بعض تاریخوں میں تین فتاویٰ کا ذکر ملتا ہے- لیکن ان تینوں میں سے صرف ایک فتویٰ کی نقل مطبوعہ شکل میں موجود و محفوظ ہے- کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں ہی دہلی کے ایک اخبار نے اس کی نقل شائع کر دی

تھی-منشی ذکاءاللہ دہلوی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد دہلی کے اندر انگریزوں کے خلاف جہاد پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور اسی روز متعدد علماء کے دستخط کے ساتھ خود علامہ ہی کی تحریک پر ایک فتوی جہاد جاری ہوا-اسی طرح بریلی میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، مرادآباد میں مولانا کفایت علی کافی، بدایوں میں مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ نے فتاویٰ جاری کیے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا ماحول تیار کیا-

سوال (۴):-مسلمانوں کا کون سا طبقہ انگریزوں کی تائید وحمایت میں تھا؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-اس میں بھی ہم کوئی تعین نہیں کر سکتے، مسلمانوں کے ہر طبقے میں مخالف بھی نظر آتے ہیں اور موافق بھی-علماء میں بھی بہت سے انگریزوں کے ساتھ تھے، زمین داروں میں بھی بہت ساتھ تھے، شعراء میں بھی بہت سے ساتھ تھے، غدار شعراء بھی ہیں جنھوں نے انگریزوں کی حمایت کی اور وہ شعراء بھی ہیں جن کے کلام کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں شہید کرادیا، تو آپ تعین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس طبقے نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس نے ان کی مخالفت کی، دہلی کے مولوی باقر جو دہلی کے اردو اخبار کے ایڈیٹر تھے انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے اداریے لکھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا-لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، سادات میں بھی کچھ ایسے تھے جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ سادات ایسے تھے جو ان کے خلاف تھے-شعراء میں غالب کے کلام میں بھی انگریزوں سے نفرت ہے، لیکن غالب کی دو تصویریں ہمارے سامنے ہے، ایک تصویر انگریزوں کی موافقت میں ہے جب کہ دوسری مخالفت میں ہے-غالب کے مقابلے دوسرے شعراء کو دیکھیں تو انہوں نے انگریزوں کے خلاف زیادہ واضح باتیں کیں مثلاً مولوی محمد حسین آزاد کو لیجیے جو مولوی باقر کے بیٹے تھے-انہوں نے انگریزوں کے خلاف نظمیں لکھیں جو دہلی اردو اخبار میں چھپیں-ان کے علاوہ مرادآباد اور امروہہ کے شعراء جن کا قد نسبتاً چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے کوئی ان کا نام نہیں لیتا، انہوں نے انگریزوں کے خلاف خوب لکھا اور ان میں سے بہتوں کو دار ورسن کے پھندے چومنے پڑے-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند

میں انقلاب تو کیا کوئی قابل ذکر جنبش بھی نہیں ہوئی اور نظام حیدرآباد تو انگریز نواز تھے ہی، ادھر دلی سے متصل صوبۂ پنجاب جو ہمیشہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن مانا جاتا رہا تھا، یہ بازو نہ جانے کیوں مجموعی طور پر مفلوج رہا، ادھر روہیل کھنڈ میں نواب رام پور نظام حیدرآباد کی طرح انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے اور مرادآباد وغیرہ میں انقلابیوں کی بیخ کنی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ہندوؤں کے درمیان اگرچہ منگل پانڈے، رام کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے، راجا ناہر سنگھ جیسے جواں مرد اور جیالے نظر آتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ہندوؤں کے اندر وہ جوش وخروش نہیں تھا جو مسلمانوں کے اندر جگہ جگہ پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو زیادہ نشانہ بنایا اور لاکھوں مسلم عوام کے ساتھ ہزاروں علما کو پھانسی دی یا کالا پانی بھیجا، یا انہیں تباہ وبرباد کیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر جوش وخروش اور جذبۂ جہاد علما کے فتاویٰ کی بنیاد پر ہی تھا اور ان کا جذبہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں نے مکر وفریب اور ظلم وجارحیت کے ذریعے یہ ملک ہم سے چھینا ہے، اس لیے ہمیں بڑھ کر ان انگریزوں سے بزور قوت وطاقت دوبارہ اپنی اس میراث کا وارث بننا ہے اور اس ملک پر ہمیں اپنی حکومت قائم کرنی ہے-

سوال (۵):-انقلاب ۱۸۵۷ء کے موقع پر ہندو مسلم اتحاد کی کیا صورت تھی؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-اس وقت ہندو مسلم اتحاد تھا، لیکن انگریزوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی-جیسے ایک دستاویز مجھے ملا کہ انگریزوں نے اس زمانے میں پچاس ہزار روپے بریلی کے کلکٹر کو بھیجے تاکہ اسے ہندوؤں میں تقسیم کیا جائے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جائے، لیکن انگریز اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو گئے-بریلی کے کلکٹر نے باضابطہ یہ خط لکھا کہ ہم یہ پیسے واپس کر رہے ہیں کیوں کہ ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے-تو اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی، بعض میں انہیں کامیابی بھی ملی، لیکن فی الجملہ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی صورت بہتر تھی-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-انگریز مجموعی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں کا مشترکہ دشمن تھا، کیوں کہ ہندو اور مسلمان ہی اس ملک کی غالب اکثریت تھی، اس لیے کئی جگہوں پر ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی، لیکن یہ سب کے سب بہادر

شاہ ظفر کو ہی اپنا بادشاہ سمجھتے تھے، یہ سب اسی لیے کہ رانی لکشمی بائی، نانا پیشوا، تانتیہ ٹوپے وغیرہ نے سبز پرچم لہرایا تھا، بہادر شاہ ظفر کو دلی کے تخت وتاج کا اصل مالک سمجھتے تھے-

سوال (٦):-آزادی ۱۹۴۷ء پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے کیا اثرات رہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-آزادی کی لڑائی کا آغاز تو ۱۸۵۷ء سے ہی ہوا، اسی لیے اسے پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں کامیابی کے بعد تین یونیورسٹیز قائم کیں، مدراس، بمبئی اور کلکتہ اور یہ اتفاق ہے کہ جو ہندوستانی ان یونیورسٹیز میں پڑھے، فراغت کے بعد انہی لوگوں نے آزادی کی باضابطہ جدوجہد کا آغاز کیا اور نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۷ء میں اپنا ملک انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا-علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ۱۸۵۷ء کی دین ہے، ظاہر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے بعد ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دلایا جائے اور انہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھایا جائے تاکہ جدید صنعتی انقلاب کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی ہے مسلمان اس کا مقابلہ کر سکیں- مدرسے تفسیر وحدیث کی تعلیم تو دے رہے تھے، لیکن جو صنعتی انقلاب ظہور پذیر ہوا تھا مسلمان اس کا مقابلہ کیسے کرتے، اس کے لیے جدید تعلیم کا حصول ضروری تھا- اس طرح ہم علی گڑھ تحریک کو بھی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ہی نتیجہ سمجھتے تھے- اس طرح ہم یہ کہہ سکتے کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی انقلاب ۱۸۵۷ کا ہی نتیجہ ہے-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-کئی مورخین نے صاف صاف یہ تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء دراصل ۱۸۵۷ء کا تکملہ ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے کے زعماء وقائدین کو تحریک دراصل ۱۸۵۷ء ہی سے ملی اور ہمارا ہندوستان مدتوں بعد آزادی سے ہمکنار ہوا اور یہ واضح ہے کہ حال کی تاریخ کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور بہت سی چیزوں کے اثرات ونتائج کسی نہ کسی شکل میں بعد میں ظاہر ہوتے ہیں- یہی معاملہ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کا بھی ہے-

سوال (۷):-ملکی سطح پر انقلاب ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مسلمانوں خصوصاً علماء کو نظرانداز کرنے کے کیا اسباب ہیں؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:-دیکھیے! دوسروں پر الزام دینے سے پہلے ہمیں اپنا محاسبہ

کرنا چاہیے کہ ہم نے کیا کام کیا؟ ہندوستان اور پاکستان میں صرف ۱۸۵۷ء کے ۷۰ ہزار Documents موجود ہیں اور یہ سب کے سب اردو اور فارسی میں ہیں- اب یہ بتائیے ان دستاویزات کی تحقیق اور چھان بین کون کرے گا؟ پروفیسر گیان شرما یا پروفیسر نرادری بھٹاچاریہ ان دستاویزات پر کیسے کام کریں گے؟ یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ ذمہ داری ہے شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی، شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کی، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی، شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامی نئی دہلی کی اور عربی مدارس کے ان اساتذہ کی جو اردو اور فارسی جانتے ہیں، سوال ہے کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود آخر کیوں ان لوگوں نے ان دستاویزات پر کام نہیں کیا؟ کب تک ہم دوسروں کو یہ الزام لگاتے رہیں گے کہ ہمارا نام نہیں آتا- آپ کا نام جب آئے گا جب آپ کام کریں گے- آپ جب میرا انٹرویو لینے آئے ہیں جب ہی تو میں آپ کو انٹرویو دے رہا ہوں- اگر آپ میرے پاس آتے ہی نہیں تو میں کیسے آپ کو انٹرویو دیتا- تو سب سے پہلے ہم خود ذمہ دار ہیں- آزاد ہندوستان میں مسلم ثقافت کے تحفظ کی ذمہ داری دو اداروں پر ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ- تو آپ پہلے ان پر سوال اٹھائیے بہ نسبت دوسرے دانشوروں کے جو دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہیں- ہم تو خود کچھ کام کرتے نہیں اور بیٹھے بیٹھے دوسروں پر الزام دھرتے اور شکوے کرتے ہیں- ہم سرسید پر بھی الزام دھرتے رہتے ہیں، لیکن آخر ہمارے اندر سرسید جیسا کام کرنے کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ تو صرف دوسروں کو الزام دینے سے کام نہیں چل سکتا، ہمیں خود کام کرنا ہوگا- مرادآباد میں جو لوگ مارے گئے، جو شہید کیے گئے جو لوٹے گئے، کیا مرادآباد والوں کو آج ان کے نام معلوم ہیں؟ علی گڑھ کے مسلمانوں کو اپنے شہیدوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ آپ ہمیں بتائیے کہ جتنے بڑے شہر ہیں، دہلی، علی گڑھ، مرادآباد وغیرہ ان شہروں کی مسلم تنظیموں نے ۱۸۵۷ء پر کوئی پروگرام کیا؟ تو کون ہائی لائٹ کرے گا؟ آپ کو دینک جاگرن، ہندوستان اور دوسرے ہندی یا انگریزی اخبارات جب ہی تو شائع کریں گے جب آپ مدرسے میں اپنے ادارے میں ۱۸۵۷ء پر پروگرام کریں گے، بتائیے

مرادآباد، بریلی، سہارنپور، امروہہ، علی گڑھ کے کسی مدرسے نے اس پر کوئی پروگرام کیا اور نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟ ۱۰رمئی سے اس کی ۱۵۰رسالہ سال گرہ شروع ہوگئی اور آج ۲۶رجون ہو گیا کسی ادارے نے کوئی پروگرام نہیں کیا، میں نے کوئی خبر نہیں پڑھی-تو صرف دہلی یونیورسٹی اور جواہرلال نہرو یونیورسٹی کیوں ذمہ دار ہیں؟ پہلے تو ہمارے ادارے ذمہ دار ہیں، ہم ذمہ دار ہیں، ہمارے علماء ذمہ دار ہیں، دانشور ذمہ دار ہیں، ان لوگوں نے اس پر کیا کام کیا؟ جو بڑے بڑے عہدے اور مناصب لیے ہوئے ہیں وہ اس طرف کیوں نہیں توجہ کرتے؟ جامع مسجد کو دوسال تک انگریزوں نے اصطبل بنائے رکھا، تو کیا دہلی کی جامع مسجد میں کوئی پروگرام ہوا اس حوالے سے کہ ہمیں اپنی تاریخ معلوم ہوتی؟ صرف دوسروں کو ملزم ٹھہرانے سے کام نہیں چلے گا- پہلے ہمیں کام کرنا ہوگا، پہلے ہمیں کتابیں لکھنی ہوں گی، جب ہماری تحریریں دوسرے پڑھیں گے تب ان کی تحریروں میں وہ باتیں آئیں گی-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر اور چرچا اس کی حیثیت اور عظمت کے مطابق نہ کیا جانا ایک نہایت افسوس ناک رویہ ہے اور اس رویے کو جلد از جلد تبدیل کیا جانا چاہیے- ہندو تو اس کے ذکر سے عموماً اس لیے کتراتے ہیں کہ انقلاب کی کمان اور باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی- لیکن بعض مسلمان دانش ور اور مورخین بھی اسے اس لیے نظر انداز کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں کی کمان علماء کے ہاتھوں میں تھی اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ طبقۂ علما کو یہ حضرات کس نگاہ سے دیکھتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ حتی الامکان ان افراد کی تاریخ اور اس کے قائدین کے حالات توڑ مروڑ کر پیش کیے جاتے ہیں اور اصل حیثیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے-

سوال (۸):- انقلاب ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰رویں برسی پر ہندوستانیوں کو اس سے کون سا سبق ملتا ہے؟

پروفیسر سید عزیز الدین احمد:- ۱۸۵۷ء سے ہندوستانیوں کو بہت بڑا سبق ملتا ہے، وہ یہ کہ آج کے حالات ۱۸۵۷ء سے بہت مختلف نہیں ہیں، اگر آج ہم میں وہی غفلت رہی جو ۱۸۵۷ء کے موقع پر تھی تو غیر ملکی طاقتیں پھر سے ہمیں اپنا غلام بنالیں گی، ویسے بھی ہم آج

یورپ کی ٹکنالوجی کی دنیا میں غلام ہیں، انہی کی ایجاد کردہ چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ جو چیزیں وہ ۲۰رسال پہلے استعمال کر چکے ہوتے ہیں انہیں ہم آج استعمال کرتے ہیں- خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی ہم غیر ملکی طاقتوں کی غلامی قبول کیے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں- ہماری غفلت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یورپ میں زمانے سے جمہوریت قائم ہے اور اسی جمہوریت کی وجہ سے اہل یورپ بہت آگے بڑھ چکے ہیں، جب کہ ہمارے یہاں آج بھی بہت سے مسلم ممالک میں موروثی بادشاہت قائم ہے، آپ خود سوچیے کہ موروثی بادشاہت سے کیا ہم خاک ترقی کریں گے؟ تو مسلم دنیا کو خاص طور پر ۱۸۵۷ء سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے یہاں جمہوریت نہیں قائم کی اور موروثی بادشاہت سے چمٹے رہے تو ان کا حشر بھی مغل حکومت سے مختلف نہیں ہوگا- آپ ایران کی مثال لیں جہاں ۱۹۷۹ء میں جمہوریت قائم ہوئی اور آج وہ کسی لائق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ یوروپی ممالک کے نشانے پر بھی ہے- حاصل یہ کہ تمام مسلم ممالک میں جمہوریت لانے کی کوشش ہونی چاہیے، ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سلسلے میں کسی عالم کی کوئی تحریر نہیں پڑھتے، پتہ نہیں کس مصلحت نے ان کی زبانیں بند کر رکھی ہیں، جب کہ جمہوریت کا پہلا داعی اسلام ہے- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں سب سے پہلے اسلامی جمہوریت قائم کی تھی- بعد میں ہم نے ملوکیت کو قبول کرلیا، یہی ہمارے زوال کا سبب بنی، ہے اور رہے گی-

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- اس تاریخی انقلاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ قوم کو غلام نہیں بلکہ آزاد رہنا چاہیے- اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو مضبوط اور منظّم رکھنا چاہیے، اسی طرح اپنی صفوں میں پائے جانے والے غداروں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے اور کسی بھی خارجی قوت کے مقابلے میں ہندو مسلمان دونوں کو سیاسی سطح پر متحدہ اقدام کرنا چاہیے- آج کے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف برطانیہ نہیں بلکہ پورے یورپ اور ان سب کے آقا امریکہ نے سیاسی اور تجارتی راستوں سے ہندوستان کے اندر گھس پیٹھ اور اسے کنٹرول کرنے کی جو نئی مہم چھیڑ رکھی ہے اور بظاہر ایک بہت چھوٹے مگر اندر سے نہایت خطرناک اور مضبوط عنصر جسے یہودی لابی کہا جاتا ہے، ان سب سے ہمیں قدم قدم پر ہوشیار رہنا چاہیے-□□□